مسلمانوں پر
قرآن مجید کے حقوق

تالیف

ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36کے، ماڈل ٹاؤن لاہور۔فون: 3-35869501
www.tanzeem.org

بسم اللہ الرحمن الرحیم

☆

پیشِ نظر کتابچہ
اس کے حقیر اور ناچیز مؤلف نے
نومبر ۱۹۷۰ء میں —— مدینہ منورہ میں
مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ
کی خدمت میں اس استدعا کے ساتھ پیش کیا کہ وہ اسے ایک نظر دیکھ لیں اور
اگر کوئی غلطی محسوس ہو تو اصلاح فرما دیں اس لئے کہ مولف اسے بڑی تعداد
میں شائع کرنا چاہتا ہے

الحمد للہ کہ حضرت مولاناؒ نے
مسجدِ نبوی ﷺ میں بحالتِ اعتکاف
اسے بالاستیعاب پڑھا اور صرفِ ایک مقام پر اصلاح تجویز فرمائی جو
دوسرے ایڈیشن میں کر دی گئی!
اس طرح اب اس کتابچے کو بحمد اللہ حضرت مولاناؒ کی کلی تصدیق و تصویب کی
سعادت حاصل ہے!

خاکسار **اسرار احمد** عفی عنہ

اس کتابچے کی طباعت واشاعت کی ہر شخص کو کھلی اجازت ہے!!

نام کتاب .... ’’مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق‘‘
طبع نمبر1 تا38(1969ء تا جون2009ء)........................4,48,800
ناشر .... مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
مقام اشاعت .... 36-K ماڈل ٹاؤن لاہور
مطبع .... شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

یہ مضمون دراصل ایک تقریر پر مبنی ہے جو اوّلاً جنوری ۱۹۶۸ء میں مسلسل دو جمعوں میں جامع مسجد خضراء سمن آباد لاہور میں کی گئی۔ پھر اسی ماہ شہر قصور کی ایک جامع مسجد میں خطاب کا اتفاق ہوا تو وہاں بھی یہی مضامین کسی قدر اختصار کے ساتھ بیان ہوئے۔ پھر فروری ۱۹۶۸ء میں اجمل باغ کالج صادق آباد' تعمیر ملت ہائی سکول سکھر اور گورنمنٹ کالج جھنگ میں انہی مضامین پر مشتمل تقاریر کی گئیں — بعدہٗ اسے مرتب کر کے کسی قدر اضافے کے ساتھ ماہنامہ ’’میثاق‘‘ کی مئی و جون ۱۹۶۸ء کی اشاعتوں میں شائع کیا گیا۔ اور اب مزید اضافوں کے ساتھ کتابچے کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے — مقصد بالکل واضح ہے' یعنی یہ کہ مسلمانوں کو ’’رجوع الی القرآن‘‘ کی دعوت دی جائے اور انہیں قرآن مجید کو پڑھنے' سمجھنے اور اپنی زندگی کا لائحہ عمل بنانے پر آمادہ کیا جائے — اگر کسی کو اس تحریر کے مطالعے سے اپنے دل کی گہرائیوں میں قرآنِ حکیم کی جانب رغبت و شوق کا جذبہ پیدا ہوتا محسوس ہو تو اس کی خدمت میں استدعا ہے کہ وہ راقم کے لیے امن و ایمان اور سلامتی و اسلام ☆ کی دعا فرمائے!

دعاجو

خاکسار: اسرار احمد

☆ایک مسنون دعا: اَللّٰھُمَّ اَھِلَّہٗ عَلَیْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِیْمَانِ وَالسَّلَامَۃِ وَالْاِسْلَامِ

مظاہرہ کیا جاتا ہے جو قرآن مجید کی تعلیمات پر ایک کھلا طنز ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ الحاد پسند اور اباحیت پرست لوگوں کے لیے اس قسم کے بے شمار جشنوں کے اہتمام کے ساتھ جشنِ نزولِ قرآن مجید کا انعقاد غالباً ایک رشوت ہے جو مذہبی ذوق رکھنے والے لوگوں کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ واللہ اعلم۔

دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ اس قسم کی تقریبات سے اگر یہ فائدہ اٹھایا جائے کہ ان کے ذریعے عوام میں دین و مذہب سے لگاؤ پیدا ہو‘ قرآن حکیم کے ساتھ ان کا ربط و تعلق بڑھے اور اس بُعد میں کمی ہو جو آج ہمارے اور قرآن مجید کے مابین پیدا ہو گیا ہے‘ تو پھر بھی ان کے انعقاد کے جواز کا کوئی پہلو شاید پیدا کیا جا سکے‘ لیکن جیسا کہ آپ کو معلوم ہے اس قسم کا کوئی فائدہ اس نوعیت کی تقاریب سے حاصل نہیں ہوتا۔ قرآن کی تزئین و آرائش یا حسنِ قراءت کے مظاہروں اور مقابلوں سے تو بہرحال اس قسم کے کسی فائدے کے حصول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو کانفرنسیں یا جلسے قرآن مجید کے نام پر منعقد ہوتے ہیں ان میں بھی اکثر سارا زور قرآن مجید کے مقام و مرتبہ کی وضاحت یا اس کی شان کے بیان پر صرف کر دیا جاتا ہے اور اس بات کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے کہ ہم پر بحیثیت مسلمان قرآن مجید کے کیا کیا حقوق عائد ہوتے ہیں اور ان کی ادائیگی کی کیا صورت ممکن ہے! حالانکہ جہاں تک قرآن مجید کے مقام یا مرتبے اور شان و عظمت کا تعلق ہے‘ واقعہ یہ ہے کہ اس کا بیان تو کجا کما حقہٗ ادراک بھی کسی انسان کے بس میں نہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ ؏ قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند گوہری!

قرآن حکیم کے اصل مقام و مرتبہ کا علم صرف اُس شاہِ ارض و سماوات کو ہے جس کا یہ کلام ہے اور اس کی حقیقی قدر و قیمت سے آگاہ صرف وہ ذاتِ بابرکت ہے جس پر یہ نازل ہوا‘ صلی اللّٰہ علیہ وسلم۔ (۱)

ہمارا اصل کام یہ ہے کہ پوری دیانت داری کے ساتھ پہلے یہ سمجھیں کہ اس کتابِ

(۱) قرآن مجید کی حقیقی قدر و منزلت اور واقعی مقام و مرتبہ کا ادراک عام انسانی ادراکات کی سطح سے اس قدر ماوراء ہے کہ فکرِ انسانی کی رہنمائی کے لیے خود قرآن نے ایک تمثیل کے ذریعے اس کا بس ایک ہلکا سا تصور پیش کیا ہے کہ:

(باقی اگلے صفحہ پر)

مبارک کے کیا حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں۔ پھر یہ دیکھیں کہ آیا ہم انہیں ادا کر رہے ہیں یا نہیں۔ اور اگر یہ معلوم ہو کہ ایسا نہیں ہے کہ تو پھر یہ سوچیں کہ ان کی ادائیگی کی کیا صورت ممکن ہو سکتی ہے اور پھر بلا تاخیر اس کے لیے سرگرمِ عمل ہو جائیں۔ اس لیے کہ اس کا براہِ راست تعلق ہماری عاقبت اور نجات سے ہے اور اس معاملے میں کسی کوتاہی کی تلافی قرآن حکیم کی شان میں قصیدے پڑھنے سے بہرحال نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ میں آج کی صحبت میں انہی امور پر کسی قدر وضاحت سے گفتگو کروں گا۔

ہر مسلمان پر قرآن مجید کے پانچ حقوق

ثقیل الفاظ یا دینی اصطلاحات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے عام زبان میں بیان کیا جائے تو قرآن مجید کے یہ پانچ حقوق ہر مسلمان پر عائد ہوتے ہیں:

ایک یہ کہ اسے مانے۔ (ایمان و تعظیم)

دوسرے یہ کہ اسے پڑھے۔ (تلاوت و ترتیل)

تیسرے یہ کہ اسے سمجھے۔ (تذکر و تدبر)

چوتھے یہ کہ اس پر عمل کرے۔ (حکم و اقامت)

اور پانچویں یہ کہ اسے دوسروں تک پہنچائے۔ (تبلیغ و تبیین)

اب میں چاہتا ہوں کہ ان پانچوں حقوق کی قدرے تفصیل ان اصطلاحات کی مختصر تشریح کے ساتھ آپ حضرات کے سامنے پیش کروں جو خود قرآن مجید میں ان کے لیے استعمال ہوئی ہیں‘ تاکہ ضمنی فائدے کے طور پر آپ حضرات قرآن مجید کی بعض بنیادی اصطلاحات سے بھی مانوس ہو جائیں۔

(گزشتہ صفحہ سے)

﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ۭ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۝﴾ (الحشر: ۲۱)

’’اگر ہم اُتار دیتے اس قرآن کو کسی پہاڑ پر تو تم دیکھتے کہ وہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ پڑتا۔ اور یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور کریں۔‘‘

ایمان و تعظیم

ماننے کا اصطلاحی نام ایمان ہے اور اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک ''اِقْــرَارٌ بِاللِّسَانِ'' اور دوسرے ''تَـصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ''۔ اقرارِ لسانی دائرۂ اسلام میں داخلے کی شرطِ لازم ہے اور تصدیق قلبی حقیقی ایمان کا لازمہ ہے۔

قرآن پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ زبان سے اس کا اقرار کیا جائے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے' جو برگزیدہ فرشتے حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے اللہ کے آخری رسول حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا۔ اس اقرار سے انسان دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاتا ہے' لیکن حقیقی ایمان اسے اُس وقت نصیب ہوتا ہے جب ان تمام امور پر ایک پختہ یقین اس کے قلب میں پیدا ہو جائے۔ پھر ظاہر ہے کہ جب یہ صورت پیدا ہو جائے گی تو خود بخود قرآن کی عظمت کا نقش قلب پر قائم ہو جائے گا اور جوں جوں قرآن پر ایمان بڑھتا جائے گا اس کی تعظیم و احترام میں بھی اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ گویا ایمان و تعظیم لازم و ملزوم ہیں۔

قرآن حکیم سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پر ایمان سب سے پہلے خود نبی کریم ﷺ اور آپ کے ساتھی رضوان اللہ علیہم اجمعین لائے۔

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ﴾ (البقرۃ: ۲۸۵)

''ایمان لایا رسولؐ اس پر جو نازل کیا گیا اس کی جانب اور (اس کے ساتھی) اہلِ ایمان۔''

یہ ایمان پورے تصدیق قلب کے ساتھ تھا اور اس گہرے یقین پر مبنی تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو اس کی تعظیم و احترام کا گہرا نقش ان کے قلوب پر ثبت ہو گیا اور دوسری طرف گہری محبت اور والہانہ عشق کا ایک تعلق اس کے ساتھ قائم

ہو گیا۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کو نزولِ وحی کا شدت کے ساتھ انتظار رہتا تھا اور آپؐ اس کے لیے بے چین رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ وحی جلد جلد آیا کرے۔ پھر جب قرآن اترتا تھا تو آپؐ کمالِ شوق سے جلد از جلد اس کو یاد کر لینے کی کوشش کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ازراہِ محبت و شفقت ان امور میں مبالغے سے منع فرمایا۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ:

﴿وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ......﴾ (طٰہٰ: ۱۱۴)

''قرآن کے لیے جلدی نہ کرو۔''

اور

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۞﴾ (القیامۃ: ۱۶)

''قرآن (کو یاد کرنے) کی جلدی میں اپنی زبان کو (تیزی سے) حرکت نہ دو۔''

نزولِ قرآن کے ابتدائی دَور میں جب ایک بار وحی کی آمد میں قدرے دیر ہو گئی تو یہ وقفہ آنحضور ﷺ پر اس قدر شاق گزرا کہ حضورؐ فرماتے ہیں کہ شدتِ غم سے میں سوچتا تھا کہ اپنے آپ کو پہاڑ پر سے گرا دوں۔ رات کا اکثر حصہ آپ ﷺ اپنے پروردگار کے حضور میں کھڑے ہو کر قرآن پڑھتے ہوئے گزار دیتے تھے' حتیٰ کہ آپ کے پائے مبارک متورم ہو جاتے تھے اور قرآن ہی کی شہادت ہے کہ ایک تہائی' آدھی اور دو تہائی رات اس طرح بسر کرنے میں بہت سے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی آپؐ کا اتباع کرتے تھے۔ جیسا کہ مَیں بعد میں تفصیل سے عرض کروں گا' اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم ہفتے میں ایک بار ضرور قرآن مجید ختم کرتے تھے اور خود حضور ﷺ' جن پر قرآن نازل ہوا' ان کا حال یہ تھا کہ صحابہؓ سے باصرار فرمائش کر کے قرآن مجید سنا کرتے تھے اور بسا اوقات شدتِ تاثر سے آپؐ کے آنسو بہہ نکلتے تھے۔

آنحضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قرآن سے اس گہرے شغف اور اس کی جانب اس قدر التفات کا سبب یہ تھا کہ انہیں یہ ''حق الیقین'' حاصل تھا کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اس کے بالکل برعکس ہمارا حال ہے۔ قرآن کے مُنزَّل من اللہ ہونے کا اقرار تو

ہم کرتے ہیں‘ اور اس پر بھی خدا کا جتنا شکر کیا جائے کم ہے کہ اس نے ہمیں ان لوگوں میں پیدا فرما دیا جو قرآن کو خدا کا کلام مانتے ہیں‘ لیکن‘ اِلا ماشاءاللہ‘ اس کے کلامِ الٰہی ہونے کا یقین ہمیں حاصل نہیں اور درحقیقت یہی ہمارے قرآن سے بُعد اور اس کی جانب عدمِ التفات وتوجہ کا اصل سبب ہے۔ آپ شاید میری اس بات سے ناراض ہوں لیکن اگر ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور ان کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ واقعی ہمارے قلوب قرآن پر یقین سے خالی ہیں اور ریب اور شک نے ہمارے دلوں میں ڈیرا ڈالا ہوا ہے۔ ہماری اس کیفیت کا نقشہ قرآن مجید نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

﴿وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ۝﴾

(الشوریٰ : ١٤)

”اور جو لوگ وارث ہوئے کتابِ الٰہی کے ان کے بعد وہ اس کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا ہیں۔“

یہی وجہ ہے کہ نہ ہمارے دلوں میں اس کی کوئی عظمت ہے‘ نہ اس کو پڑھنے پر ہماری طبیعت آمادہ ہوتی ہے‘ نہ اس پر غور وفکر کی کوئی رغبت ہم اپنے اندر پاتے ہیں اور نہ ہی اسے زندگی کا واقعی لائحہ عمل بنانے کا خیال کبھی ہمیں آتا ہے۔ اس پوری صورتِ حال کا اصل سبب ایمان اور یقین کی کمی ہے اور جب تک اسے دُور نہ کیا جائے کسی وعظ ونصیحت سے کوئی پائیدار نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا۔

لہٰذا ہم میں سے ہر ایک کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے دل کو اچھی طرح ٹٹولے اور دیکھے کہ وہ قرآن مجید کو بس ایک متوارث مذہبی عقیدے (dogma) کی بنا پر ایک ایسی ”مقدس آسمانی کتاب“ سمجھتا ہے جس کا زندگی اور اس کے جملہ معاملات سے کوئی تعلق نہ ہو‘ یا اسے یقین ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے جو اس لیے نازل ہوا ہے کہ لوگ اس سے ہدایت پائیں اور اسے اپنی زندگیوں کا لائحہ عمل بنائیں۔

اگر دوسری بات ہے تو فہو المطلوب‘ اور اگر پہلا معاملہ ہے‘ اور مجھے اندیشہ ہے کہ ہماری ایک عظیم اکثریت کے ساتھ یہی صورت ہے‘ تو پھر سب سے پہلے ایمان کی اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ اس لیے کہ قرآن مجید کے دوسرے تمام حقوق کی ادائیگی کا مکمل انحصار اسی پر ہے۔

پوچھا جاسکتا ہے کہ اس کمی کو پورا کرنے کی عملی تدبیر کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایمان کی تحصیل کا سب سے زیادہ آسان اور سب سے بڑھ کر مؤثر ذریعہ تو اصحابِ ایمان ویقین کی صحبت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے قلوب میں ایمان ویقین کی جو کیفیت مجسمۂ ایمان اور پیکرِ یقین ﷺ کی صحبت کی بدولت پیدا ہوئی تھی اس کا تصور بھی اب ناممکن ہے۔ آپؐ کی وفات کے بعد بھی عوام الناس تو نورِ ایمانی کے اکتساب کے لیے ایسے خواص کی صحبت ہی کے محتاج ہیں جن کے دلوں میں ایمان ویقین کی شمعیں روشن ہوں‘ لیکن خود اُن ”خواص“ کے لیے نورِ ایمان کا سب سے بڑا منبع قرآن مجید ہے۔ اور اس کے بعد اخبار وآثار اور سیرتِ رسول ﷺ اور سیر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ایسا مطالعہ جس سے طالب کو حضورؐ اور صحابہؓ کی معنوی صحبت میسر آجائے۔ رہا خود قرآن پر یقین اور اس میں اضافہ تو اس کا تو بس ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ خود قرآن مجید ہے۔(1)

جیسا کہ میں بعد میں کسی قدر تفصیل سے عرض کروں گا‘ ایمان درحقیقت کوئی خارج سے ٹھونسی جانے والی چیز ہے ہی نہیں‘ اس کی شمع تو انسان کے اپنے باطن میں روشن ہے اور اس کا قلب بذاتِ خود وہ جامِ جہاں نما ہے جس میں کائنات کے وہ تمام حقائق ازخود منعکس ہیں جن کا دوسرا نام ایمان ہے۔ ہوتا صرف یہ ہے کہ غلط ماحول اور غلط تعلیم وتربیت کے اثرات سے انسان کی شمعِ باطن کی روشنی دھندلا

(1) ؎ وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی قاری کو یہ قرآں کے سیپاروں میں
(مولانا ظفر علی خان)

جاتی ہے[۱] اور اس کے اعمال بد کے سبب سے اس کا آئینۂ قلب مکدر ہو جاتا ہے![۲]

اور اس آئینے کو صیقل کرنے اور انسان کی اس شمع باطن کے نور کو اجاگر کرنے کے لیے ہی کلامِ الٰہی ﴿تَبۡصِرَۃً وَّ ذِکۡرٰی لِکُلِّ عَبۡدٍ مُّنِیۡبٍ ۝﴾[۳] بن کر نازل ہوا ہے۔ تلاشِ حق کی نیت سے اسے پڑھا اور اس پر غور و فکر کیا جائے تو سارے حجابات دُور ہوتے چلے جاتے ہیں اور انسان کا باطن نورِ ایمان سے جگمگا اٹھتا ہے۔

یہ تو ہوئی نورِ ایمانی کی اوّلین تحصیل' اس کے بعد بھی جب کبھی غفلت یا غلبۂ بہیمیت کے سبب سے آئینۂ قلب غبار آلود ہو جائے تو اس کے جلاء و صیقل کا مؤثر ترین ذریعہ قرآن مجید ہی ہے' جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے مطابق آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ ھٰذِہِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ کَمَا یَصْدَأُ الْحَدِیْدُ اِذَا اَصَابَهُ الْمَاءُ)) قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا جِلَاءُ ھَا؟ قَالَ: ((کَثْرَۃُ ذِکْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَۃُ الْقُرْآنِ)) (بیہقی)

''بنی آدم کے قلوب بھی اسی طرح زنگ آلود ہو جاتے ہیں جیسے لوہا پانی پڑنے سے!'' دریافت کیا گیا: یا رسول اللہ! اس زنگ کو دُور کس چیز سے کیا جائے؟ فرمایا: ''موت کی بکثرت یاد اور قرآن مجید کی تلاوت!''

خلاصۂ کلام یہ کہ محض ایک متوارث عقیدے کے طور پر قرآن کو ایک مقدس آسمانی کتاب ماننے سے ہماری موجودہ صورتِ حال میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی اور قرآن مجید کے ساتھ عدم التفات کا جو رویہ ہمارا اس وقت ہے' وہ نہیں بدل سکتا۔ قرآن مجید کے جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کی ادائیگی کی اوّلین شرط یہ ہے کہ سب سے پہلے ہمارے دلوں میں یہ یقین پیدا ہو کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور ہماری

(۱) ((کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ...... الخ)) (حدیث نبویؐ) ''ہر انسان فطرت سلیمہ پر پیدا ہوتا ہے' پھر اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔''

(۲) ﴿کَلَّا بَلۡ ٜ رَانَ عَلٰی قُلُوۡبِہِمۡ مَّا کَانُوۡا یَکۡسِبُوۡنَ ۝﴾ (المطففین:۱۴) ''نہیں' بلکہ ان کے اعمال کے نتیجے میں ان کے قلوب پر زنگ چڑھ گیا ہے۔''

(۳) سورۂ ق' آیت ۸: ''سجھانے والی اور یاددہانی ہر اُس بندے کے لیے جو (خدا کی طرف) رجوع کرے۔''

ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے۔

اس یقین کے پیدا ہوتے ہی قرآن کے ساتھ ہمارے تعلق میں ایک انقلاب آ جائے گا۔ یہ احساس کہ یہ ہمارے اس خالق و مالک کا کلام ہے جس کی ذات تبارک و تعالیٰ وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے' اور جس کا کسی ادنیٰ ترین درجے میں بھی کوئی تصور ہمارے بس میں نہیں اور جس کی ذات کے ادراک سے عجز کا احساس ہی بقول افضل البشر بعد الانبیاء کمالِ ادراک[۱] ہے' ہمارے فکر و نظر میں ایک انقلاب برپا کر دے گا۔ پھر ہمیں محسوس ہوگا کہ اس زمین کے اوپر اور اس آسمان کے نیچے قرآن سے بڑی کوئی دولت اور اس سے عظیم تر کوئی نعمت موجود نہیں۔[۲]

پھر اس کی تلاوت ہماری روح کی غذا اور اس پر غور و فکر ہمارے قلوب و اذہان کے لیے روشنی بن جائیں گے۔ اور یقیناً یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی کہ اس کی تلاوت سے ہم کبھی سیر نہ ہو سکیں گے اور اپنی بہترین ذہنی و فکری صلاحیتوں اور اپنی پوری عمر کو اس پر تدبر و تفکر میں کھپا کر بھی ہم محسوس کریں گے کہ ؏

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا!

(۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ایک قول ''اَلْعِجْزُ عَنْ درکِ الذَّاتِ اِدْرَاکٌ'' جس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ گرہ لگائی کہ ''وَالْبُحْثُ عَنْ کُنْہِ الذَّاتِ اِشْرَاکٌ''

(۲) جیسا کہ ایک حدیث میں آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص کو قرآن ایسی دولت عطا ہوئی اور پھر بھی اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کسی اور کو اس سے بڑھ کر نعمت ملی ہے' اس نے قرآن کی قدر و منزلت کو نہ پہچانا۔

تلاوت و ترتیل

قرآن کے پڑھنے کے لیے خود قرآن مجید میں اگرچہ قراءت اور تلاوت دونوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں' لیکن احترام و تعظیم کے ساتھ اسے ایک مقدس آسمانی کتاب سمجھتے ہوئے ذہنی اور نفسیاتی طور پر اپنے آپ کو اس کے حوالے کر کے اتباع اور پیروی کے جذبے کے ساتھ قرآن کو پڑھنے کے لیے اصل قرآنی اصطلاح ''تلاوت'' ہی کی ہے۔ اس لیے بھی کہ یہ لفظ صرف آسمانی صحیفوں کے پڑھنے کے لیے خاص ہے' جبکہ قراءت ہر چیز کے پڑھنے کے لیے عام ہے اور اس لیے بھی کہ تلاوت کا لغوی مفہوم ساتھ لگے رہنے اور پیچھے پیچھے آنے کا ہے' جبکہ قراءت مجرد جمع وضم کے لیے آتا ہے۔

عام گفتگو میں ابتداءً قراءت کا لفظ قرآن سیکھنے اور اس کے علم کی تحصیل کے لیے استعمال ہوتا تھا اور قاری عالمِ قرآن کو کہا جاتا تھا' لیکن بعد میں یہ اصطلاح قرآن کو اہتمام اور تکلف کے ساتھ قواعدِ تجوید کی خصوصی رعایت اور حروف کے مخارج کی صحت کا پورا پورا لحاظ کرتے ہوئے پڑھنے کے لیے خاص ہوتی چلی گئی' جبکہ تلاوت کا اطلاق عام طریقے پر انابت اور خشوع و خضوع کے ساتھ حصولِ برکت و نصیحت کی غرض سے قرآن پڑھنے پر ہونے لگا۔

تلاوتِ کلامِ پاک ایک بہت بڑی عبادت ہونے کے ساتھ ساتھ ایمان کو تر و تازہ رکھنے کا مؤثر ترین ذریعہ ہے۔

قرآن صرف ایک بار پڑھ لینے کی چیز نہیں ہے بلکہ بار بار پڑھنے اور ہمیشہ پڑھتے رہنے کی چیز ہے' اس لیے کہ یہ روح کے لیے بمنزلۂ غذا ہے اور جس طرح جسمِ انسانی اپنی بقاء و تقویت کے لیے مسلسل غذا کا

محتاج ہے جو انسان کے جسدِ حیوانی کی طرح سب زمین ہی سے حاصل ہوتی ہے اسی طرح روحِ انسانی جو خود آسمانی چیز ہے' کلامِ ربّانی کے ذریعے مسلسل تغذیہ و تقویت کی محتاج ہے!

اگر قرآن بس ایک مرتبہ پڑھ لینے کی چیز ہوتی تو کم از کم نبی اکرم ﷺ کو تو اس کے بار بار پڑھنے کی قطعاً کوئی حاجت نہ تھی۔ لیکن قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کو مسلسل قرآن پڑھتے رہنے کی بار بار تاکید ہوئی۔ عہدِ رسالت کے بالکل ابتدائی ایام میں تو انتہائی تاکیدی حکم ہوا کہ رات کا اکثر حصہ اپنے ربّ کے حضور میں کھڑے ہو کر ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھتے ہوئے بسر کرو۔ بعد کے ادوار میں بھی' خصوصاً جب مشکلات و مصائب کا زور ہوتا تھا اور صبر و استقامت کی خصوصی ضرورت ہوتی تھی' آنحضور ﷺ کو تلاوتِ قرآن ہی کا حکم دیا جاتا تھا۔ چنانچہ سورۃ الکہف میں ارشاد ہوا ہے:

﴿وَاتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ كِتٰبِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝﴾ (الکھف : ٢٧)

''اور پڑھا کر جو وحی ہوئی تجھ کو تیرے پروردگار کی کتاب سے۔ کوئی اس کی باتوں کا بدلنے والا نہیں اور نہ ہی تو کہیں پا سکے گا اس کے سوا پناہ کی جگہ۔''

اور سورۃ العنکبوت میں ارشاد ہوا:

﴿اُتْلُ مَا اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ﴾ (العنکبوت : ٤٥)

''پڑھا کر جو وحی ہوئی تیری طرف کتابِ الٰہی اور قائم رکھ نماز کو!''

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی تلاوت مسلسل کرتے رہنا ضروری ہے اور یہ مؤمن کی روح کی غذا' اس کے ایمان کو تر و تازہ اور سرسبز و شاداب رکھنے کا اہم ترین ذریعہ اور مشکلات و موانع کے مقابلے کے لیے اس کا سب سے مؤثر ہتھیار ہے۔

کتابِ الٰہی کے اصل قدردانوں کی یہ کیفیت قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے کہ:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ۭ﴾ (البقرۃ : ١٢١)

''جن لوگوں کو ہم نے کتاب عطا فرمائی وہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے۔''

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس آیت کریمہ کا مصداق بنائے اور ہم سب کو توفیق دے کہ ہم قرآن مجید کا حقِ تلاوت ادا کر سکیں۔ لیکن اس کے لیے سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ قرآن کی تلاوت کا حق ہے کیا؟ اور اس کی ادائیگی کی شرائط کیا ہیں؟

۱) تجوید

اس سلسلے میں سب سے پہلی ضروری چیز قرآن مجید کے حروف کی شناخت‘ ان کے مخارج کا صحیح علم اور رموزِ اوقافِ قرآنی کی ضروری معلومات کی تحصیل ہے‘ جسے اصطلاحاً تجوید کہتے ہیں اور جس کے بغیر قرآن مجید کی صحیح اور رواں تلاوت ممکن نہیں۔ آج سے تیس چالیس سال قبل تک ہر مسلمان بچے کی تعلیم کی ابتدا اسی سے ہوئی تھی اور وہ سب سے پہلے قرآن کے حروف کی پہچان اور ان کی صحیح ادائیگی کی صلاحیت حاصل کرتا تھا۔ افسوس کہ اِدھر ایک عرصے سے مساجد و مکاتب کی تعلیم کے زوال اور کنڈرگارٹن قسم کے مدارس کے رواج کی بدولت یہ صورتِ حال پیدا ہو چکی ہے کہ مسلمان قوم کی نوجوان نسل کی ایک عظیم اکثریت حتیٰ کہ بہت سے بوڑھے اور ادھیڑ عمر کے لوگ بھی قرآن مجید کو ناظرہ پڑھنے پر بھی قادر نہیں۔ میں ایسے تمام حضرات سے گزارش کروں گا کہ وہ اپنی اس کمی کا احساس کریں اور جلد از جلد اسے دُور کرنے کی کوشش کریں‘ اور خواہ وہ عمر کے کسی بھی مرحلے میں ہوں قرآن مجید کو صحیح پڑھنے کی صلاحیت لازماً پیدا کریں۔ ساتھ ہی ہمیں چاہیے کہ اپنی اولاد کے بارے میں یہ طے کر لیں کہ ان کی تعلیم کی ابتدا اسی سے ہو گی اور سب سے پہلے وہ قرآن کے حروف کی پہچان اور ان کو صحیح مخارج سے ادا کرنا سیکھیں گے۔ اس معاملے میں حد سے زیادہ غلو تو اگرچہ اچھا نہیں لیکن قرآن مجید کو روانی کے ساتھ صحیح اصوات و مخارج اور رموزِ اوقاف کی رعایت و لحاظ کے ساتھ پڑھنے پر قادر ہونا تو ہر معمولی پڑھے لکھے انسان کے لیے بھی لازم اور قرآن مجید کے حق تلاوت کی ادائیگی کی شرطِ اوّلین ہے۔

۲) روزانہ کا معمول

قرآن مجید کے حق تلاوت کی ادائیگی کے لیے دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ

تلاوتِ قرآن کو زندگی کے معمولات میں مستقل طور پر شامل کیا جائے اور ہر مسلمان تلاوت کا ایک مقررہ نصاب پابندی کے ساتھ لازماً پورا کرتا رہے۔ مقدارِ تلاوت مختلف لوگوں کے لیے مختلف ہو سکتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ مقدار جس کی آنحضور ﷺ نے توثیق فرمائی ہے‘ یہ ہے کہ تین دن میں قرآن ختم کیا جائے‘ یعنی دس پارے روزانہ پڑھے جائیں۔ اور کم سے کم مقدار‘ جس سے کم کا تصور بھی ماضی قریب تک نہ کیا جا سکتا تھا‘ یہ ہے کہ ایک پارہ روزانہ پڑھ کر ہر مہینے قرآن ختم کر لیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ وہ کم از کم نصاب ہے جس سے کم پر تلاوتِ قرآن کے معمول کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ درمیانی درجہ جس پر اکثر صحابہ ؓ عامل تھے اور جس کا حکم بھی ایک روایت کے مطابق آنحضور ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو دیا تھا‘ یہ ہے کہ ہر ہفتے قرآن ختم کر لیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ دورِ صحابہ ؓ میں قرآن کی تقسیم سورتوں کے علاوہ صرف سات احزاب میں تھی(۱) جن میں سے پہلے چھ احزاب علی الترتیب تین‘ پانچ‘ سات‘ نو‘ گیارہ اور تیرہ سورتوں پر مشتمل ہیں اور ساتواں جو حزبِ مفصل کہلاتا ہے‘ بقیہ قرآن مجید پر مشتمل ہے۔ اس طرح ہر حزب کم و بیش چار پاروں کا بنتا ہے جن کی تلاوت انتہائی سکون و اطمینان کے ساتھ دو گھنٹوں میں کی جا سکتی ہے جو دن رات کے عشر سے بھی کم ہے۔

تلاوتِ قرآن مجید کا یہ نصاب ہر اُس شخص کے لیے لازمی ہے جو دینی مزاج اور مذہبی ذوق رکھتا ہو اور قرآن مجید کا حقِ تلاوت ادا کرنے کا خواہش مند ہو‘ چاہے وہ عوام میں سے ہو یا اہلِ علم و فکر کے طبقے سے تعلق رکھتا ہو‘ اس لیے کہ جہاں تک روح کے تغذیہ و تقویت کا تعلق ہے اس کے اعتبار سے تو سب ہی اس کے محتاج ہیں۔ اس کے علاوہ عوام کو اس سے ذکر و موعظت حاصل ہو گی اور اہلِ علم و فکر حضرات اس سے اپنے علم کے لیے روشنی اور فکر کے لیے رہنمائی پائیں گے۔(۲) حتیٰ کہ وہ حضرات بھی جو دن رات قرآن حکیم پر تفکر و تدبر میں لگے رہتے ہوں اور قرآن کی ایک ایک سورت پر

(۱) واضح رہے کہ تیس پاروں اور رکوعوں میں قرآن کی تقسیم بعد کی چیز ہے۔

(۲) واقعہ یہ ہے کہ اصحاب فکر جو خرد کی کسی گتھی کو سلجھانے میں مگن ہوں اور سخت (باقی اگلے صفحہ پر)

برسوں غور و فکر کرتے اور اس کے مشکل مقامات پر عرصۂ دراز تک توقف کرتے ہوں' وہ بھی قرآن کی اس تلاوتِ مسلسل سے مستغنی نہیں' بلکہ ان کو اس کی دوسروں کی بہ نسبت زیادہ ہی ضرورت ہے' اس لیے کہ قرآن کی تلاوتِ مسلسل سے اُن کی بہت سی مشکلیں از خود حل ہوتی چلی جاتی ہیں اور بے شمار نئے پہلو سامنے آتے رہتے ہیں۔

۳) خوش الحانی

قرآن کی تلاوت کے حقوق میں سے یہ بھی ہے کہ ہر شخص اپنی حد تک بہتر سے بہتر اسلوب' اچھی سے اچھی آواز اور زیادہ سے زیادہ خوش الحانی سے قرآن مجید کی تلاوت کرے۔ اس لیے کہ حسنِ سماعت کا ذوق کم و بیش ہر انسان میں ودیعت کیا گیا ہے اور اچھی آواز ہر شخص کو بھاتی ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہے اور انسان کے کسی فطری جذبے کو یکسر ختم نہیں کرتا' بلکہ تمام فطری داعیات کو صحیح راستوں پر ڈالتا ہے۔ حسنِ نظر اور حسنِ سماعت انسان کے فطری داعیات میں سے ہیں۔ قرآن مجید کی خوبصورت اور خوش نما کتابت سے ایک مؤمن کے حسنِ نظر کو حقیقی تسکین حاصل ہوتی ہے اور اس کی خوش الحانی کے ساتھ قراءت اس کے ذوقِ سماعت کو آسودگی عطا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضور ﷺ نے تاکیداً فرمایا ہے:

((زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِاَصْوَاتِكُمْ)) (۲)

''قرآن کو اپنی آوازوں سے مزین کرو۔''

ساتھ ہی اس معاملے میں کوتاہی پر ان الفاظ میں تنبیہ فرمائی کہ:

((مَنْ لَّمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ فَلَيْسَ مِنَّا)) (۳)

(گزشتہ صفحہ سے) اُلجھن میں ہوں' بسا اوقات قرآنِ حکیم کی تلاوتِ مسلسل کے دوران یہ محسوس کریں گے کہ جیسے دفعتاً ان کی گتھی سلجھ گئی اور الجھن حل ہوگئی اور قرآن مجید کے کسی ایسے مقام سے انہیں روشنی حاصل ہوگئی جس کو اس سے قبل بے شمار مرتبہ پڑھا تھا' لیکن چونکہ وہ مسئلہ ذہن میں موجود نہ تھا' لہٰذا اس پہلو کی جانب توجہ نہ ہوئی تھی۔

(۱) عن البراء بن عازب رضی اللّٰہ عنہ' رواہ ابوداوٗد والنسائی

(۲) عن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ' رواہ ابوداوٗد

''جو قرآن کو خوش الحانی سے نہ پڑھے وہ ہم میں سے نہیں۔''

اور اس کے لیے مزید تشویق کے لیے خبر دی ہے کہ:

((مَا اَذِنَ اللّٰهُ لِشَیْءٍ مَا اَذِنَ لِنَبِیٍّ اَنْ يَتَغَنّٰى بِالْقُرْآنِ يَجْهَرُ بِهٖ)) (۱)

''اللہ تعالیٰ کسی چیز پر اس طرح کان نہیں لگاتا جس طرح نبیؐ کی آواز پر لگاتا ہے جبکہ وہ قرآن کو خوش الحانی کے ساتھ بآوازِ بلند پڑھ رہا ہوتا ہے۔''

بارہا ایسا ہوتا تھا کہ حضور ﷺ راہ چلتے کسی صحابیؓ کو اچھی آواز سے قرآن پڑھتے ہوئے سنتے تو دیر تک کھڑے ہو کر سنتے رہتے تھے اور بعد میں اس کی تحسین بھی فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ آپؐ فرمائش کر کے بھی صحابہؓ سے قرآن مجید سنا کرتے تھے۔ چنانچہ حدیث میں ایک واقعہ آتا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے قرآن سنانے کی فرمائش کی۔ انہوں نے عرض کیا: ''حضورؐ! کیا آپ کو قرآن سناؤں؟ حالانکہ آپ ہی پر تو وہ نازل ہوا ہے!'' آپؐ نے فرمایا: ''ہاں میں چاہتا ہوں کہ دوسرے سے سنوں!'' چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ نے آپؐ کو قرآن سنایا اور آپؐ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے — اسی طرح ایک بار آپؐ نے ایک صحابی (حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ) کو حسنِ صوت کے ساتھ قرآن پڑھتے سنا اور ان الفاظ میں تحسین فرمائی کہ تمہیں مزامیرِ آلِ داؤد (علیہ السلام) میں سے حصہ ملا ہے۔

اس معاملے میں بھی غلو اگرچہ مضر ہے' خصوصاً جب اس میں تصنع یا ریا شامل ہو جائیں اور اس کی صورت ایک پیشے کی بن جائے تب تو یہ مہلکات میں سے شمار ہونے والی چیز بن جاتی ہے' لیکن ہر شخص کو اپنے ذوقِ حسنِ سماعت کی تسکین بہر حال قرآن کی تلاوت و سماعت ہی میں تلاش کرنی چاہیے' اور خود اپنے حدِ امکان تک اچھے سے اچھے طریقے پر تلاوت کی سعی کرنی چاہیے۔

۴) آدابِ ظاہری و باطنی

قرآن کے حقِ تلاوت کی ادائیگی کی شرائط میں سے تلاوت کے کچھ ظاہری اور

(۱) عن سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ' رواہ ابوداوٗد

باطنی آداب بھی ہیں۔ یعنی یہ کہ انسان باوضو ہو' قبلہ رُخ بیٹھ کر تلاوت کرے' اور اس کی ابتدا تعوّذ سے کرے۔ پھر یہ کہ اس کا دل کلام اور صاحبِ کلام دونوں کی عظمت سے معمور ہو۔ حضورِ قلب' خشوع وخضوع اور انابت ورجوع الی اللہ کے ساتھ تلاوت کرے' اور خالص طلبِ ہدایت کی نیت اور قرآن حکیم کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو بدلنے کے عزمِ مصمم کے ساتھ قرآن کو پڑھے' اور مسلسل تذکر وتدبر اور تفہم وتفکر کرتا رہے اور اپنے خودساختہ خیالات ونظریات کی سند قرآن سے حاصل کرنے کے لیے نہیں' بلکہ حتی الامکان معروضی طور پر اس سے ہدایت اخذ کرنے کے لیے پڑھے۔ اس لیے کہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' تلاوت کا لغوی مفہوم ''پیچھے لگنے'' اور ''ساتھ رہنے'' کا ہے' اور نفس میں حوالگی وسپردگی کی کیفیت تلاوت کا اصل جوہر ہے۔

۵) ترتیل

تلاوت قرآن پاک کی اعلیٰ ترین صورت یہ ہے کہ نماز (خصوصاً تہجد) میں اپنے ربّ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو کر انتہائی سکون اور اطمینان کے ساتھ متذکرہ بالا تمام شرائط کی پابندی کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر اور توقف کرتے ہوئے قرآن پڑھا جائے جس سے قلب پر اثرات مترتب ہوتے چلے جائیں۔ قرآن کی اصطلاح میں اس قسم کی تلاوت کا نام ترتیل ہے اور نبی اکرم ﷺ کو جو احکام بالکل ابتدائی عہدِ رسالت میں ملے ان میں سے غالباً اہم ترین حکم یہی تھا کہ:

﴿يٰاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۞ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۞ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۞ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۞﴾ (المزمل : ۱ـ۴)

''اے مزمل! رات کو کھڑے رہا کرو سوائے اس کے تھوڑے سے حصے کے' (یعنی) آدھی رات' یا اس سے کچھ کم یا اس سے کچھ زائد۔ اور قرآن کو پڑھا کرو ٹھہر ٹھہر کر۔''

قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے میں ایک گونہ مماثلت اس کے طریقِ نزول سے بھی پیدا ہو جاتی ہے' اس لیے کہ قرآن خود آنحضور ﷺ پر ''جُمْلَةً وَّاحِدَةً'' یعنی یک

بارگی نہیں اترا' بلکہ تھوڑا تھوڑا اترا ہے۔ اور سورۃ الفرقان میں اللہ تعالیٰ نے کفار کا یہ اعتراض نقل کر کے کہ آخر پورا قرآن ایک ہی بار کیوں نازل نہیں ہو جاتا' جواباً آنحضور ﷺ سے خطاب کر کے فرمایا ہے کہ:

﴿كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۞﴾ (الفرقان : ۳۲)

''اسی طرح (اتارا) تاکہ ہم اس کے ذریعے تمہارے دل کو ثبات عطا فرمائیں' چنانچہ پڑھ سنایا ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر۔''

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ترتیل تثبیت قلبی کا مؤثر ذریعہ ہے اور اس طرح قرآن پڑھنے سے قلبِ انسانی کو زیادہ سے زیادہ فیض وافادہ حاصل ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ شدتِ تاثر سے قلب پر گریہ طاری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابنِ عربی صاحبِ ''احکام القرآن'' نے ترتیل کی تفسیر میں حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ آنحضور ﷺ کا گزر ایک ایسے شخص پر ہوا جو قرآن مجید اس طرح پڑھ رہا تھا کہ ایک ایک آیت پڑھتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا۔ اس پر حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا: ''کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا قولِ مبارک ﴿وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا﴾ نہیں سنا؟ دیکھ لو یہ ہے ترتیل!'' قرآن مجید کو بطریقِ ترتیل تلاوت کرنے ہی کا حکم ہے آنحضور ﷺ کے اس قولِ مبارک میں کہ:

((اُتْلُوا الْقُرْآنَ وَابْكُوْا)) (ابن ماجه)

''قرآن کو پڑھو اور روؤ!''

چنانچہ خود نبی اکرم ﷺ کی صلوٰۃِ لیل کی یہ کیفیت روایات میں بیان ہوئی ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے جوشِ گریہ سے آپؐ کے سینۂ مبارک سے ایسی آواز نکلتی تھی جیسے کوئی ہانڈی چولہے پر پک رہی ہو۔

۶) حفظ

اس ترتیل کی شرط لازم یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ قرآن یاد کیا جائے۔ بدقسمتی سے اس کا ذوق بھی ہمارے یہاں کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا ہے۔ ایک تو حفظِ

قرآن کی صرف یہ صورت مروّج رہ گئی ہے کہ پورا کلامِ پاک حفظ کیا جائے اور اس کے لیے ظاہر ہے کہ بچپن ہی کا زمانہ موزوں ہوسکتا ہے' جبکہ کلام پاک کا مفہوم سمجھنے کا کوئی سوال ہی سرے سے پیدا نہیں ہوتا۔ اگرچہ اس کا ذوق بھی اب کم ہورہا ہے اور الّا ماشاءاللہ حفظِ قرآن صرف غرباء کے ایک طبقے کے لیے ایک پیشہ بن کر رہ گیا ہے۔ حالانکہ بالکل ماضی قریب میں یہ حال تھا کہ شرفاء اور اچھے کھاتے پیتے گھرانوں میں حفظِ قرآن کا چرچا تھا اور ہندوستان کے بعض شہر تو ایسے بھی تھے جن میں اکثر گھروں میں کئی کئی حافظِ قرآن ہوتے تھے اور وہ گھرانا نہایت منحوس سمجھا جاتا تھا جس میں کوئی ایک شخص بھی حافظ نہ ہو۔ حفظِ قرآن کا یہ سلسلہ نہایت مبارک ہے اور حفاظتِ قرآن کی خدائی تدابیر میں سے ہے اور اس کی جانب بھی از سرِ نو توجہ وانہماک کی شدید ضرورت ہے' لیکن میں یہاں بالخصوص جس حفظ کا تذکرہ کر رہا ہوں وہ حفظ وہ ہے جو ترتیلِ قرآن کا حق ادا کرنے کے لیے ہر مسلمان پر واجب ہے' یعنی یہ کہ ہر مسلمان مسلسل زیادہ سے زیادہ قرآن یاد کرنے کے لیے کوشاں رہے تاکہ اس قابل ہو سکے کہ رات کو اپنے ربّ کے حضور میں کھڑے ہو کر اس کا کلام اسے سنا سکے! افسوس ہے کہ اس کا ذوق بالکل ہی ختم ہو گیا ہے حتیٰ کہ علماء تک اس سے مستغنی ہو گئے ہیں' اور ائمہ مساجد جنہیں قرآن مجید سے سب سے زیادہ شغف ہونا چاہئے ان کا حال بھی یہ ہو گیا ہے کہ بس جتنا قرآن کبھی یاد کر لیا تھا اسی پر قناعت کئے بیٹھے ہیں اور ادل بدل کر انہی حصوں کو نمازوں میں پڑھتے رہتے ہیں۔

اس کے برعکس ہونا یہ چاہئے کہ ہر شخص قرآن کے اس حصے کو جو اُسے یاد ہو' اپنا اصل اثاثہ اور سرمایہ سمجھے اور اس میں مسلسل اضافے کے لیے کوشاں رہے' تاکہ تلاوتِ قرآن کی سب سے اعلیٰ صورت یعنی ترتیل سے زیادہ سے زیادہ حظ حاصل کر سکے۔ اور اپنی روح کو زیادہ سے زیادہ غذا عمدہ سے عمدہ صورت میں فراہم کر سکے۔!

تیسرا حق

تذکر و تدبر

ماننے اور پڑھنے کے بعد تیسرا حق قرآن مجید کا یہ ہے کہ اسے ''سمجھا'' جائے اور ظاہر ہے کہ کلامِ الٰہی نازل ہی اس لئے ہوا ہے اور اس پر ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کا فہم حاصل کیا جائے۔ بغیر فہم کے مجرد تلاوت کا جواز ایسے لوگوں کے لئے تو ہے جو پڑھنے لکھنے سے بالکل محروم رہ گئے ہوں اور اب تعلیم کی عمر سے بھی گزر چکے ہوں۔ ایسے لوگ اگر ٹوٹے پھوٹے طریق پر تلاوت کر لیں تو بھی بہت غنیمت ہے اور اس کا ثواب انہیں ضرور ملے گا' بلکہ ایک ایسا اَن پڑھ شخص جو ناظرہ بھی نہ پڑھ سکتا ہو اور اب اس کے لئے اس کا سیکھنا بھی ممکن نہ ہو' اگر اس یقین کے ساتھ کہ قرآن اللہ کا کلام ہے' اسے کھول کر بیٹھتا ہے اور محبت وعقیدت اور احترام وتعظیم کے ساتھ اس کی سطور پر محض انگلی پھیرتا رہتا ہے تو اس کے لئے اس کا یہ عمل بھی یقیناً موجب ثواب و برکت ہوگا۔ لیکن (۱) پڑھے لکھے لوگ جنہوں نے تعلیم پر زندگیوں کا اچھا بھلا عرصہ صرف کر دیا ہو اور دنیا کے بہت سے علوم وفنون حاصل کئے ہوں' مادری ہی نہیں غیر ملکی زبانیں بھی سیکھی ہوں' اگر قرآن مجید کو بغیر سمجھے پڑھیں تو عین ممکن ہے کہ وہ قرآن کی تحقیر وتوہین اور تمسخر

(۱) دراصل یہی وہ حقیقت ہے جو ایک حدیث میں بیان ہوئی' لیکن جس سے یہ بات بالکل غلط طور پر سمجھی گئی کہ اچھا بھلا پڑھا لکھا اور صاحبِ استعداد آدمی بھی قرآن کو بے سمجھے بوجھے اور غلط سلط پڑھنے پر بھی عنداللہ ثواب کا حقدار ہوگا:

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْآنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ وَالَّذِيْ يَقْرَءُ الْقُرْآنَ وَيَتَتَعْتَعُ فِيْهِ وَهُوَ عَلَيْهِ شَاقٌّ لَّهٗ اَجْرَانِ)) (بخاری و مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قرآن کے ماہر کا درجہ تو معزز اور وفادار اور فرمانبردار فرشتوں کا ہے ہی' رہا وہ شخص جو قرآن کو پڑھتے ہوئے اٹکتا ہو اور اس کے لئے زحمت اور مشقت اٹھاتا ہو تو اس کے لئے دوہرا اجر ہے''۔

واستہزاء کے مجرم گردانے جائیں اور اس اعراض عن القرآن کی سزا تلاوت کے ثواب سے بڑھ جائے۔ الاّ یہ کہ وہ قرآن کا علم حاصل کرنے کا عزم کر لیں اور اس کے لئے سعی و جدوجہد شروع کر دیں تو درمیانی عرصے میں اگر مجرد تلاوت بھی کرتے رہیں تو امید ہے کہ اس کا اجر انہیں ملتا رہے گا۔

پھر ''فہمِ قرآن'' کوئی سادہ اور بسیط شے نہیں' بلکہ اس کے بے شمار مدارج و مراتب ہیں اور ہر انسان علم کے اس اتھاہ و ناپیدا کنار سمندر سے اپنی فطری استعداد' ذہنی ساخت' طبیعت کی اُفتاد۔ پھر اپنی سعی و جہد' محنت و مشقت' کدو کاوش اور تحقیق و جستجو کے مطابق حصہ پا سکتا ہے' حتیٰ کہ کوئی انسان خواہ کیسی ہی اعلیٰ استعداد کا مالک کیوں نہ ہو اور کتنی ہی محنت و کاوش کیوں نہ کر لے' پھر چاہے پوری کی پوری عمر قرآن پر تدبر و تفکر میں بسر کر دے' یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی بھی مرحلے پر پہنچ کر وہ سیر ہو جائے اور یہ محسوس کرے کہ قرآن کا فہم کما حقہٗ اسے حاصل ہو گیا ہے' اس لئے کہ خود صادق و مصدوق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قرآن کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ ایک ایسا خزانہ ہے جس کے عجائبات کبھی ختم نہ ہوں گے اور جس پر غور و فکر سے انسان کبھی فارغ نہ ہو سکے گا۔[1] **وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ** ۔ پس چاہئے کہ اصحابِ عزم و ہمت اور اربابِ حوصلہ و امنگ اس میدان کو اپنے حوصلوں اور امنگوں کی آماجگاہ بنائیں اور اس میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کریں۔

''سمجھ'' کے لئے یوں تو قرآن مجید نے فہم و فکر اور عقل و فقہ کے قبیل کے تمام ہی الفاظ استعمال کئے ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ فہمِ قرآن کے لئے وسیع ترین اصطلاح

(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک طویل حدیث میں قرآن کے بارے میں آنحضور ﷺ کے یہ الفاظ نقل ہوئے ہیں:

((وَلَا یَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا یَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِیْ عَجَائِبُهٗ))

(رواہ الترمذی والدارمی)

''علماء کبھی اس کتاب سے سیر نہ ہو سکیں گے' نہ کثرت و تکرارِ تلاوت سے اس کے لطف میں کوئی کمی آئے گی اور نہ ہی اس کے عجائبات (یعنی نئے نئے علوم و معارف) کا خزانہ کبھی ختم ہو سکے گا۔''

جو قرآن میں سب سے زیادہ استعمال ہوئی ہے وہ ذکر و تذکر کی ہے۔ چنانچہ خود قرآن اپنے آپ کو جابجا ذکر' ذکریٰ اور تذکرہ کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ اصطلاح درحقیقت فہمِ قرآن کی اوّلین منزل کا پتہ بھی دیتی ہے اور اس کی اصل غایت اور حقیقی مقصود کا سراغ بھی اس سے ملتا ہے' اور ساتھ ہی اس سے اس حقیقت کی طرف بھی رہنمائی ہوتی ہے کہ تعلیماتِ قرآنی نفسِ انسانی کے لئے کوئی اجنبی چیز نہیں ہیں بلکہ یہ درحقیقت اس کی اپنی فطرت کی ترجمانی ہے اور اس کی اصل حیثیت ''یاددہانی'' کی ہے' نہ کہ کسی نئی بات کے ''سکھانے'' کی۔ قرآن تمام ذی شعور انسانوں کو جنہیں وہ ''**اُولُوا الْاَلْبَابِ**'' اور ''**قَوْمٌ یَّعْقِلُوْنَ**'' قرار دیتا ہے' تفکر اور تعقل کی دعوت دیتا ہے اور اس کا اوّلین میدان خود آفاق و انفس کو قرار دیتا ہے جو آیاتِ الٰہی سے بھرے پڑے ہیں۔ ساتھ ہی وہ انہیں آیاتِ قرآنی میں بھی تفکر و تعقل کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ:

﴿**كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ**۝﴾ (یونس : ۲۴)

''اسی طرح ہم کھولتے ہیں اپنی آیات ان لوگوں کے لئے جو تفکر کریں۔''

اور فرمایا:

﴿**وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ الذِّكْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ**۝﴾ (النحل : ۴۴)

''اور اتارا ہم نے تم پر ذکر کہ تم جو کچھ لوگوں کے لئے اتارا گیا ہے اس کی وضاحت کرو' تاکہ وہ تفکر کریں۔''

اسی طرح:

﴿**كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ** ۝﴾ (البقرۃ : ۲۴۲)

''اسی طرح اللہ اپنی آیات کی وضاحت فرماتا ہے تاکہ تم تعقل کر سکو۔''

اور:

﴿**اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ**۝﴾ (الزخرف : ۳)

''ہم نے اسے قرآن عربی بنا کر اتارا تاکہ تم اسے سمجھ سکو۔''

آیاتِ قرآنی' آیاتِ آفاقی اور آیاتِ انفسی میں تفکر و تعقل کے نتیجے میں انسان محسوس کرتا ہے کہ ایک تو ان تینوں میں گہری ہم آہنگی پائی

جاتی ہے اور دوسرے یہ سب کامل توافق کے ساتھ بعض ایسے حقائق کی جانب رہنمائی کرتی ہیں جن کی شہادت خود اس کی اپنی فطرت میں مضمر ہے۔ اس طرح اس کے اپنے باطن کی مخفی شہادت اجاگر ہو کر اس کے شعور کے پردوں پر جلوہ فگن ہوتی ہے اور حقیقت نفس الامری کا علم، جس کا دوسرا نام ایمان ہے، اس کے شعور میں بالکل اس طرح ابھرتا ہے جیسے کسی تحریک کی بنا پر کوئی پرانی بھولی بسری بات انسان کی یادداشت کے ذخیرے کی گہرائیوں سے ابھر کر افقِ شعور پر طلوع ہوتی ہے۔ اسی عمل (phenomenon) کا نام قرآنی اصطلاح میں ''تذکر'' ہے۔

اس ''تذکر'' کی احتیاج ہر انسان کو ہے، خواہ وہ عوام الناس میں سے ہو خواہ خواص کے طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ''تذکر'' کے لئے قرآن کو انتہائی آسان بنا دیا ہے اور قرآن کی ایک ہی سورت میں چار مرتبہ یہ فرما کر کہ:

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝﴾ (القمر: ۱۷، ۲۲، ۳۲، ۴۰)

''ہم نے آسان بنا دیا ہے قرآن کو ذکر کے لئے، تو ہے کوئی یاددہانی سے فائدہ اٹھانے والا؟''

ہر انسان پر حجت قائم کر دی ہے کہ خواہ وہ کتنی ہی کم اور کیسی ہی معمولی استعداد کا حامل کیوں نہ ہو، فلسفہ و منطق اور علوم و فنون سے کتنا ہی نابلد اور زبان و ادب کی نزاکتوں اور پیچیدگیوں سے کتنا ہی ناواقف کیوں نہ ہو، وہ قرآن سے تذکر کر سکتا ہے، بشرطیکہ اس کی طبع سلیم اور فطرت صحیح ہو اور ان میں ٹیڑھ اور کجی راہ نہ پا چکی ہو — اور وہ قرآن کو پڑھتے ہوئے اس کا ایک سادہ مفہوم روانی کے ساتھ سمجھتا چلا جائے۔

''تیسیر قرآن للذکر'' کے متعدد پہلو ہیں۔ مثلاً ایک تو یہی کہ اس کا اصل موضوع اور اساسی مضامین فطرتِ انسانی کے جانے پہچانے ہیں اور قرآن کو پڑھتے ہوئے ایک سلیم الطبع انسان خود اپنے باطن کی آواز سن رہا ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس

کا طریقِ استدلال نہایت فطری اور انتہائی سادہ ہے۔ مزید یہ کہ مشکل مضامین کو نہایت دل نشین مثالوں کے ذریعے آسان بنا دیا گیا ہے۔ تیسرے یہ کہ اس کے باوجود کہ یہ ادب کا شاہکار اور فصاحت و بلاغت کی معراج ہے، اس کی زبان عام طور پر نہایت آسان ہے اور عربی زبان کی تھوڑی سی سوجھ بوجھ اور معمولی سا ذوق رکھنے والا شخص بھی بہت جلد اس سے مانوس ہو جاتا ہے اور بہت ہی کم مقامات ایسے رہ جاتے ہیں جہاں ایسے شخص کو دقت پیش آئے۔

لیکن تذکر بالقرآن کے لئے بھی عربی زبان کا بنیادی علم بہرحال ناگزیر ہے اور متن کے ساتھ ساتھ قرآن کے کسی مترجم نسخے میں ترجمہ دیکھتے رہنا اس مقصد کے لئے قطعاً ناکافی ہے اور میں پوری دیانت داری کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ عربی کی اس قدر تحصیل کہ انسان قرآن مجید کا ایک رواں ترجمہ از خود سمجھ سکے اور تلاوت کرتے ہوئے بغیر متن سے نظر ہٹائے اس کے سرسری مفہوم سے آگاہ ہوتا چلا جائے، ہر پڑھے لکھے مسلمان کے لئے فرضِ عین کا درجہ رکھتا ہے۔

اور میں نہیں سمجھتا کہ ایک ایسا مسلمان جس نے کچھ بھی پڑھا لکھا ہو، کجا یہ کہ غیر ملکی زبان تک سیکھی ہو، بی اے اور ایم اے پاس کیا ہو، ڈاکٹری اور انجینئرنگ جیسے مشکل علوم و فنون حاصل کئے ہوں، وہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں اتنی سی عربی بھی نہ سیکھ سکنے پر کیا عذر پیش کر سکے گا جس سے وہ اس کے کلام پاک کا فہم حاصل کر سکتا۔ حضرات! میں پورے خلوص اور خیر خواہی کے ساتھ آپ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ ایسے لوگوں کا عربی سیکھ کر قرآن کا فہم حاصل کرنے سے باز رہنا اللہ کے کلام کا تمسخر اور استہزاء ہی نہیں بلکہ اس کی تحقیر و توہین ہے اور آپ خود سوچ لیں کہ اپنے اس طرزِ عمل سے ہم اپنے آپ کو اللہ کی کیسی شدید بازپُرس اور کتنی سخت عقوبت کا مستحق بنا رہے ہیں۔!

میرے نزدیک عربی زبان کی کم از کم اتنی تحصیل کہ قرآن مجید کا سرسری مفہوم انسان کی سمجھ میں آ جائے' ہر پڑھے لکھے مسلمان پر قرآن کا وہ حق ہے جس کی عدم ادائیگی نہ صرف قرآن بلکہ خود اپنے آپ پر بہت بڑا ظلم ہے۔

فہمِ قرآن کا دوسرا مرتبہ ''تدبرِ قرآن'' کا ہے۔ یعنی یہ کہ قرآن کو گہرے غور و فکر کا موضوع بنایا جائے اور اس کے علم و حکمت کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کی کوشش کی جائے۔ اس لئے کہ قرآن ''هُدًى لِّلنَّاسِ'' ہے اور جس طرح عوام کو کائنات اور اپنی ذات کے بارے میں صحیح نقطۂ نظر اور زندگی بسر کرنے کی واضح ہدایات عطا فرماتا ہے اسی طرح خواص اور اصحابِ علم و فکر کے لئے بھی کامل ہدایت اور مکمل رہنمائی ہے اور ان کے ذہنی و فکری سفر کے ہر مرحلے اور ہر موڑ پر ان کی دستگیری فرماتا ہے۔

قرآن نے اپنے محلِ تدبر ہونے کو بایں الفاظ خود واضح فرمایا ہے کہ:

﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ۝﴾ (ص : ۲۹)

''(یہ قرآن) ایک کتابِ مبارک ہے جو ہم نے تمہاری طرف نازل کی تا کہ لوگ اس کی آیات پر تدبر کریں اور سمجھ دار لوگ نصیحت حاصل کریں۔''

اور عدمِ تدبر کا گلہ ان الفاظ میں کیا ہے:

﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ط﴾ (النساء : ۸۲)

''کیا یہ لوگ قرآن پر تدبر نہیں کرتے؟''

اور

﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۝﴾ (محمد : ۲۴)

''کیا یہ تدبر نہیں کرتے قرآن پر؟ یا دلوں پر لگے ہوئے ہیں ان کے قفل؟''

''تذکر'' کے اعتبار سے قرآن مجید جس قدر آسان ہے واقعہ یہ ہے کہ ''تدبر'' کے نقطۂ نظر سے یہ اسی قدر مشکل ہے اور اس سمندر میں اترنے والوں کو معلوم ہوتا ہے کہ نہ اس کی گہرائیوں کا اندازہ ممکن ہے اور نہ اس کے کناروں ہی کا سراغ کسی کو مل سکتا ہے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں اس امر کی تصریح ملتی ہے کہ وہ

ایک ایک سورت پر تدبر و تفکر میں طویل مدتیں صرف کرتے تھے حتیٰ کہ ان ہی حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے بارے میں جن کو آنحضور ﷺ نے ہفتے میں ایک بار ضرور قرآن مجید ختم کر لینے کی تاکید کی تھی' یہ تصریح ملتی ہے کہ انہوں نے صرف سورۃ البقرۃ پر تدبر میں آٹھ سال صرف کئے۔ ذرا غور فرمائیں کہ یہ ان لوگوں کا حال ہے جن کی اپنی زبان میں اور اپنی آنکھوں کے سامنے قرآن نازل ہوا تھا۔ چنانچہ نہ تو انہیں عربی زبان اور اس کے قواعد کی تحصیل کی کوئی ضرورت تھی نہ شانِ نزول اور سُور و آیات کے تاریخی پس منظر کو جاننے کے لئے کھود کرید کی کوئی حاجت۔ اس کے باوجود ایک ایک سورت پر ان کا سالہا سال غور و فکر کرنا یہ بتلاتا ہے کہ قرآن حکیم کے علم و حکمت کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کوئی آسان کام نہیں' بلکہ اس کے لئے سخت محنت اور شدید ریاضت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ بعد میں ابنِ جریر طبری' علامہ زمخشری اور امام فخر الدین رازی ایسے دسیوں بیسیوں نہیں سینکڑوں اور ہزاروں انسانوں نے اپنی پوری پوری زندگیاں کھپائیں تب بھی کسی ایک ہی پہلو سے قرآن حکیم پر غور و فکر کر سکے اور حق یہ ہے کہ حق پھر بھی ادا نہ ہوا۔ اور ان چودہ صدیوں میں کوئی ایک انسان بھی ایسا نہیں گزرا جس نے ضخیم سے ضخیم تفسیر لکھنے کے بعد بھی اس امر کا دعویٰ کیا ہو کہ اس نے قرآن حکیم پر تدبر کا حق ادا کر دیا اور اس کا فہم کما حقہ حاصل کر لیا۔ تا بہ دیگراں چہ رسد؟

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں کسی عارف کا ایک قول نقل کیا ہے جس سے قرآن کی عام تلاوت برائے تذکر اور اس پر گہرے غور و فکر کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ وہ صاحب فرماتے ہیں کہ میں ایک ختم تو قرآن مجید کا ہر جمعہ کو کر لیتا ہوں' ایک ختم میں ماہانہ کرتا ہوں اور ایک سالانہ' اور ایک اور ختم بھی ہے جس میں میں تیس سال سے مشغول ہوں اور تا حال فارغ نہیں ہو سکا۔

قرآن کو بطریقِ تدبر پڑھنے کی شرائط بڑی کڑی ہیں اور ان کا پورا کرنا اس کے بغیر ہرگز ممکن نہیں کہ ایک انسان اپنے آپ کو بس اسی کے لئے وقف کر دے اور اپنی پوری زندگی کا مصرف صرف تعلیم و تعلم قرآن ہی کو بنا لے۔ اس کے لئے اوّلاً عربی

زبان کے قواعد کا گہرا اور پختہ علم ضروری ہے۔ پھر اس کے ادب کا ایک ستھرا ذوق اور فصاحت و بلاغت کا عمیق فہم لازمی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ جس زبان میں قرآن نازل ہوا ہے اس کا صحیح فہم اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ادبِ جاہلی کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے اور دورِ جاہلی کے شعراء و خطباء کے کلام سے ممارست بہم پہنچائی جائے۔ پھر اسی پر بس نہیں‘ قرآن نے خود اپنی مخصوص اصطلاحات وضع کی ہیں اور اپنے خاص اسالیب ایجاد کئے ہیں جن سے انسان ایک طویل مدت تک قرآن کو پڑھتے رہنے اور اس پر غور کرتے رہنے کے بعد ہی مانوس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ نظمِ قرآن کا فہم بجائے خود تدبرِ قرآن کی راہ کی ایک کٹھن منزل ہے اور مصحف کی موجودہ ترتیب کی حکمت کا علم جو ترتیبِ نزولی سے قطعاً مختلف ہے‘ اور اوّلاً مختلف سورتوں اور پھر ہر سورت کی آیتوں کے باہمی ربط و تعلق کو سمجھنا ایسا مشکل مرحلہ ہے جس پر بڑے بڑے اصحابِ عزم و ہمت تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔

> لیکن ظاہر ہے کہ اس مرحلے کو سر کئے بغیر ’’تدبرِ قرآن‘‘ کے حق کی ادائیگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسی معدن سے قرآن حکیم کے علم و حکمت کے اصل موتی حاصل ہوتے ہیں اور اسی سے اس بحرِ ناپیدا کنار کی وسعتوں کا اصل اندازہ ہوتا ہے۔!

ساتھ ہی قرآن کو سمجھنے کے لئے احادیث کے تمام ذخیرے پر انسان کی گہری نظر بھی لازمی ہے اور قدیم صحفِ آسمانی کا گہرا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ ان ساری منزلوں سے گزر کر تو انسان اس قابل ہوتا ہے کہ قرآن کو بطریقِ تدبر (۱) پڑھ سکے۔ اس کے بعد ایک دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے اور وہ یہ کہ انسانی تاریخ کے ہر دَور میں تجرباتی و عقلی دونوں قسم کے علوم ایک خاص سطح پر ہوتے ہیں اور قرآن پر تدبر کا حق اس کے بغیر ادا نہیں ہوسکتا کہ حکمتِ قرآنی کا طالب اپنی معلومات کے دائرے کو کم از کم اتنا وسیع

(۱) اس موضوع پر مولانا امین احسن اصلاحی کی تالیف ’’مبادیٔ تدبر قرآن‘‘ کا بالاستیعاب مطالعہ ان شاء اللہ بہت مفید رہے گا۔

ضرور کرے کہ ان تمام علوم طبعی و نظری کا ایک اجمالی خاکہ ان کے مقدمات و مبادی‘ طریقِ استدلال اور نہج استنتاج اور نتائج و عواقب کی اجمالی معرفت سمیت اس کے ذہن کی گرفت میں آ جائے۔

> اس لئے کہ قرآن مجید کے علم و حکمت کے بحرِ زخار سے ہر طالب بہرحال اپنے ’’ظرفِ ذہنی‘‘ کے عمق اور وسعت کے مطابق ہی حصہ پا سکتا ہے اور اس کتابِ منیر کا نورِ ہدایت ہر شخص پر اس کے ’’افقِ فکر و نظر‘‘ کی وسعت کی نسبت ہی سے روشن ہوسکتا ہے— اور انسان کا ظرفِ ذہنی اور افقِ فکری بہرحال متداول علوم طبعی و عقلی ہی سے تیار ہوتا ہے۔

خاص طور پر تبلیغ و تبیین للناس کے اعتبار سے تو اس کی اہمیت بہت ہی زیادہ ہے‘ بلکہ اس کے بغیر ان کا حق ادا ہونا تو کسی درجے میں بھی ممکن نہیں‘ اس لئے کہ ہر دَور کے تجرباتی علوم کی سطح کے مطابق اور اسی کی مناسبت سے منطق و فلسفہ‘ الٰہیات و مابعد الطبیعیات‘ اخلاقیات و نفسیات اور دیگر علومِ عمرانی کا ایک طومار ہوتا ہے جس سے ذہن بالعموم مرعوب ہوتے ہیں۔ ان کے پھیلائے ہوئے غلط افکار و نظریات کا توڑ اس کے بغیر قطعاً ممکن نہیں ہوتا کہ خود ان کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور ان کے اصل سرچشموں (Original Sources) تک رسائی بہم پہنچا کر علیٰ وجہ البصیرت ان کی جڑوں پر اسی طرح ضرب کاری لگائی جائے جس طرح اپنے اپنے وقت میں امام ابنِ تیمیہ اور امام غزالی رحمہما اللہ لگا چکے ہیں۔ دورِ جدید اس معاملے میں غالباً اپنی منطقی انتہا کو پہنچ چکا ہے اور علومِ متذکرہ بالا کے علاوہ علوم طبعی (Physical Sciences) اور فنونِ صنعتی (Technology) نے انتہائی بلندیوں کو چھو کر عقلِ انسانی کو اس طرح مبہوت و ششدر کر دیا ہے کہ ایک عام انسان کے لئے ان کے جلو میں آنے والے غلط نظریات و افکار پر جرح و تنقید قطعاً ناممکن ہوگئی ہے— اندریں حالات‘ دورِ حاضر میں ’’تدبرِ قرآن‘‘ کا حق صرف اس طرح ادا ہوسکتا ہے کہ اصحابِ ہمت اور اربابِ عزیمت کی

ایک بڑی جماعت اپنے آپ کو پوری طرح کھپا کر ایک طرف تدبرِ قرآن کی متذکرہ بالا جملہ شرائط کو پورا کرے اور دوسری طرف جدید علومِ عقلی و عمرانی کی گہری و براہِ راست ممارست بہم پہنچائے' اور پھر نہ صرف یہ کہ قرآن کی روشنی میں علومِ جدیدہ کے صحیح و غلط اجزاء کو بالکل علیحدہ کر دے' بلکہ جدید استدلال اور معروف اصطلاحات کے ذریعے لوگوں کے ذہنوں کے قریب ہو کر کلام کرے اور قرآن کے نورِ ہدایت کو لوگوں کی نگاہوں کے عین سامنے روشن کر دے!۔ تاکہ ''لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ'' کا جو فریضہ آنحضورﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ میں ادا فرمایا تھا وہ اس دور میں آپؐ کی اُمت کے ذریعے پھر پورا ہو۔ اور یہ کام ظاہر ہے کہ اُس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک عالمِ اسلام میں جا بجا ایسی یونیورسٹیاں قائم نہ ہوں جن میں سے ہر ایک کا اصل مرکزی شعبہ ''تدبرِ قرآن'' کا ہو اور اس کے گرد تمام علومِ عقلی جیسے منطق' مابعد الطبیعیات' اخلاقیات' نفسیات اور الٰہیات' علومِ عمرانی جیسے معاشیات' سیاسیات اور قانون اور علومِ طبعی جیسے ریاضی' کیمیا' طبیعیات' ارضیات اور فلکیات وغیرہ کے شعبوں کا ایک حصار قائم ہو' اور ہر ایک طالب علم ''تدبرِ قرآن'' کی لازماً اور ایک یا اس سے زائد دوسرے علوم کی اپنے ذوق کے مطابق تحصیل کرے اور اس طرح ان شعبہ ہائے علوم میں قرآن کے علم و ہدایت کو تحقیقی طور پر اخذ کر کے مؤثر انداز میں پیش کر سکے۔

ظاہر ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں! اسی لئے اس پر ہر شخص مکلّف بھی نہیں۔ یہ کام اوّل تو ہے ہی صرف ان لوگوں کے کرنے کا جو علم کی ایک فطری پیاس لے کر ہی پیدا ہوتے ہیں اور جن کے ذہنوں میں ایسے سوالات از خود پیدا ہو جاتے ہیں جن کا حل عقل کی جملہ وادیاں طے کئے بغیر ممکن ہی نہیں ہوتا۔ یہ لوگ طلبِ علم پر اسی طرح ''مجبور'' ہوتے ہیں جیسے ایک بھوکا تلاشِ غذا پر یا ایک پیاسا تحصیلِ ماء پر۔ ایسے ہی لوگ مسلسل ''رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا'' کی دعا کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں' اور اگر صحیح رہنمائی میسر آ جائے تو علم و حکمت سے حصہ وافر پاتے ہیں۔ ''تدبرِ قرآن'' اصلاً تو ایسے ہی لوگوں کے کرنے کا کام ہے' ویسے ہر ''طالب علم'' اپنی اپنی استعداد اور اپنی اپنی محنت

کے مطابق اس سے فیض یاب ہو سکتا ہے اور اس کے لئے ایک عام تشویق ہی کے لئے آنحضورﷺ نے فرمایا:

((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ)) (صحیح بخاری' عن عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ)

''تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھتے اور سکھاتے ہیں۔''

اور قرآن حکیم نے ایک عام ہدایت دی کہ:

﴿فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ......﴾ (التوبہ : ۱۲۲)

''پس کیوں نہیں نکلتا ہر ہر فرقے میں سے ان کا ایک گروہ تاکہ سمجھ پیدا کرے دین میں۔''

یہ ''تفقّہ فی الدّین'' ''تدبرِ قرآن'' کا وہ ثمرہ ہے جس کے لئے آنحضورﷺ نے چیدہ چیدہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے لئے دعا فرمائی ہے(۱) اور جس کا آپﷺ نے ((خِيَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ)) کے کلیے کے ساتھ بطورِ شرط تذکرہ فرمایا ہے' یعنی یہ کہ ((اِذَا فَقُهُوْا))(۲)

(۱) جیسے مثلاً حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے لئے حضورﷺ نے ان الفاظ میں دعا فرمائی کہ ((اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ))

(۲) متفق علیہ' عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ۔ ترجمۂ حدیث: ''ان میں سے جو لوگ دورِ جاہلیت میں سب سے اچھے تھے وہی اسلام میں بھی سب سے اچھے ہیں' بشرطیکہ دین کی سمجھ حاصل کر لیں۔''

حکم و اقامت

’’ایمان و تعظیم‘‘ ’’تلاوت و ترتیل‘‘ اور ’’تذکر و تدبر‘‘ کے بعد قرآن مجید کا چوتھا حق ہر مسلمان پر یہ ہے کہ وہ اس پر عمل کرے۔ اور ظاہر ہے کہ ماننا‘ پڑھنا اور سمجھنا‘ سب فی الاصل عمل ہی کے لئے مطلوب ہیں۔ اس لئے کہ قرآن مجید نہ تو کوئی جادو یا جنتر منتر کی کتاب ہے جس کا پڑھ لینا ہی دفعِ بلیات کے لئے کافی ہو‘ نہ یہ محض حصولِ برکت کے لئے نازل ہوا ہے کہ بس اس کی تلاوت سے ثواب حاصل کر لیا جائے یا اس کے ذریعے جان کنی کی تکلیف کو کم کر لیا جائے۔[1] اور نہ ہی یہ محض تحقیق و تدقیق کا موضوع ہے کہ اسے صرف ریاضتِ ذہنی کا تختۂ مشق اور نکتہ آفرینیوں اور خیال آرائیوں کی جولانگاہ بنا لیا جائے۔ بلکہ‘ جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے‘ یہ ’’ھُـــدًی لِّـلـنَّـاسِ‘‘ یعنی انسانوں کے لئے رہنمائی ہے‘ اور اس کا مقصدِ نزول صرف اس طرح پورا ہو سکتا ہے کہ لوگ اسے واقعتاً اپنی زندگیوں کا لائحہ عمل بنا لیں۔

یہی وجہ ہے کہ خود قرآن حکیم اور اُس ذاتِ اقدس نے جس پر یہ نازل ہوا (ﷺ) اس بات کو بالکل واضح فرما دیا ہے کہ قرآن پر عمل نہ کیا جائے تو اس کی تلاوت یا اس پر غور و فکر کے کچھ مفید ہونے کا کیا سوال‘ خود ایمان ہی معتبر نہیں رہتا۔ چنانچہ قرآن مجید نے دوٹوک فیصلہ سنا دیا کہ:

﴿وَمَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ ۞﴾ (المائدۃ : ٤٤)

’’اور جو فیصلہ نہ کرے اس کے مطابق کہ جو اللہ نے نازل فرمایا تو ایسے ہی لوگ تو کافر ہیں۔‘‘

اور آنحضرت ﷺ نے مزید وضاحت فرما دی کہ:

(۱) بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست   کہ از یٰسینِ اُو آساں بمیری! (علامہ اقبال)

۱) ((لَا یُؤۡمِنُ اَحَدُکُمۡ حَتّٰی یَکُوۡنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئۡتُ بِہٖ)) (شرح السنۃ‘ علامہ بغوی)

’’تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہشِ نفس اس (ہدایت) کے تابع نہ ہو جائے جو میں لایا ہوں۔‘‘

۲) ((مَا اٰمَنَ بِالۡقُرۡآنِ مَنِ اسۡتَحَلَّ مَحَارِمَہٗ)) (ترمذی شریف)

’’جو شخص قرآن کی حرام کردہ چیزوں کو حلال ٹھہرائے وہ قرآن پر ایمان نہیں رکھتا۔‘‘

ایک ایسے شخص کا معاملہ تو مختلف ہے جو ابھی تلاشِ حق میں سرگرداں ہو اور قرآن کو پڑھ اور سمجھ کر ابھی اس کی حقانیت کے عدم یا اثبات کا فیصلہ کرنا چاہتا ہو‘ لیکن جو لوگ قرآن کو کتابِ الٰہی تسلیم کریں ان کے لئے اس سے استفادے کی شرطِ لازم یہ ہے کہ وہ اپنی زندگیوں کے رُخ کو قرآن کی سمت میں عملاً موڑ دینے اور اس کے ہر تقاضے کو پورا کرنے کی حتی الامکان سعی کے عزمِ مصمم کے بعد قرآن کو پڑھیں۔ چاہے اس میں انہیں کیسے ہی کسر و انکسار‘ ترک و اختیار اور قربانی و ایثار کے ساتھ سابقہ پیش آئے۔ بلکہ جیسا کہ اس سے قبل ’’تلاوت‘‘ کے لغوی مفہوم کے ضمن میں عرض کیا جا چکا ہے‘ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کی ہدایت تامہ تو درحقیقت ’’منکشف‘‘ ہی صرف ان لوگوں پر ہوتی ہے جو اپنے آپ کو اس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر کے اس کا مطالعہ کریں۔ اس عزمِ صادق کے بعد بھی ایک طویل مجاہدے اور کٹھن ریاضت کے بعد ہی نفسِ انسانی میں تسلیم و انقیاد کی وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جو آنحضور ﷺ کے اس قولِ مبارک میں بیان ہوئی جو ابھی میں نے آپ کو سنایا تھا۔ یعنی:

((لَا یُؤۡمِنُ اَحَدُکُمۡ حَتّٰی یَکُوۡنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئۡتُ بِہٖ))

’’تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہشِ نفس اس (ہدایت) کے تابع نہ ہو جائے جو میں لایا ہوں۔‘‘

نفسِ انسانی میں اس کیفیت کا پیدا ہو جانا قرآن کی ’’ہدایت تامہ‘‘ کا نقطۂ آغاز ہے۔ پھر جوں جوں اس کتابِ ہدایت سے تمسک بڑھتا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مزید اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

﴿وَالَّذِیۡنَ اھۡتَدَوۡا زَادَھُمۡ ھُدًی وَّاٰتٰـھُمۡ تَقۡوٰھُمۡ ۞﴾ (محمد : ١٧)

''اور جو لوگ راہ یاب ہوئے تو ان کو مزید عطا ہوئی سوجھ' اور نصیب ہوئی پرہیزگاری۔''

یعنی انسان قرآن کی انگلی پکڑ کر اس کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش عملاً شروع کر دے تو صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائے گا اور درجہ بدرجہ رشد و ہدایت میں ترقی کرتا چلا جائے گا۔ ورنہ اس کی تلاوت صرف وقت کا ضیاع ہی نہ ہوگی بلکہ عین ممکن ہے کہ اس کے لئے موجبِ لعنت ہو۔ جیسا کہ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں بعض عارفین کا قول نقل فرمایا کہ قرآن کے بہت سے پڑھنے والے ایسے ہیں جنہیں سوائے لعنت کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ جب وہ پڑھتا ہے کہ: لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ یعنی اللہ کی لعنت ہو جھوٹوں پر' تو اگر وہ خود جھوٹا ہے تو یہ لعنت اسی پر ہوئی! اسی طرح جب ایک قاری تلاوت کرتا ہے کہ:

﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ج﴾ (البقرۃ : ۲۷۹)

''اور اگر ایسے نہیں کرتے تو تیار ہو جاؤ لڑنے کے لئے اللہ اور اس کے رسولؐ سے۔''

تو اگر وہ خود اس حکمِ الٰہی سے سرتابی کرتا ہے تو اللہ اور رسولؐ کے اس ''اذانِ حرب'' (ultimatum) کا مخاطب خود وہی ہوا۔ اسی طرح کم تولنے اور تھوڑا ناپنے والے' پیٹھ پیچھے برائی کرنے والے اور رو در رو طعنہ دینے والے قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ اور وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ کی دردناک ''بشارتوں'' کے مصداق خود ہی بنتے ہیں۔ اسی پر مزید قیاس کر لیجئے کہ عمل کے بغیر قرآن مجید کی تلاوت سے انسان کو درحقیقت کیا حاصل ہوتا ہے۔

رہا ان لوگوں کا معاملہ جو قرآن حکیم پر تحقیق و تدقیق' غور و فکر اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے ہوں' لیکن خود اس کے تقاضوں کی ادائیگی سے غفلت برتیں تو ان کا معاملہ تو سب سے بڑھ کر سنگین ہو جاتا ہے اور ان کی یہ ساری کدوکاوش اور تحقیق و جستجو صرف ذہنی عیاشی ہی نہیں ''تلعّب بالقرآن'' یعنی ع ''بازی بازی با ریش بابا ہم بازی!'' کے مصداق قرآن کے ساتھ کھیل کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ نتیجتاً ان کے

اپنے حصے میں بھی قرآن سے ہدایت نہیں ضلالت آتی ہے۔

﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ط﴾ (البقرۃ : ۲۶)

''گمراہ کرتا ہے (اللہ تعالیٰ) اس سے بہت سوں کو اور ہدایت دیتا ہے اس کے ذریعے بہت سوں کو۔''

اور خلقِ خدا کے لئے بھی یہ طرح طرح کے فتنوں کا باعث اور نت نئی گمراہیوں اور ضلالتوں کا سبب بنتے ہیں' اس لئے کہ ان کا سارا ''قرآنی فکر'' اس آیتِ قرآنی کا مصداق بن جاتا ہے کہ:

﴿فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَاْوِيْلِهٖ ج﴾ (آلِ عمران : ۷)

''تو وہ پیچھے پڑتے ہیں متشابہات کے تاکہ فتنہ پیدا کریں اور ان کی حقیقت و ماہیت معلوم کریں۔''

یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے جنہیں ''تدبرِ قرآن'' کا خاص ذوق عطا ہوا تھا اور جو کئی کئی برس ایک ایک سورت پر غور و فکر اور تدبر و تفہم میں صرف کر دیتے تھے ان کے بارے میں یہ تصریح ملتی ہے کہ ان کے اس توقف کا اصل سبب یہ ہوتا تھا کہ وہ قرآن کے علم کی تحصیل کے ساتھ ساتھ اس پر پورے پورے عمل کا بھی حتی المقدور اہتمام کرتے تھے اور اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک انہیں یہ اطمینان نہیں ہو جاتا تھا کہ جتنا کچھ انہوں نے سیکھا اور پڑھا ہے اس پر عمل کی توفیق بھی انہیں حاصل ہو گئی ہے۔ آپ شاید یہ معلوم کر کے حیران ہوں کہ صحابۂ کرام ؓ قرآن کی کسی سورت یا اس کے کسی حصے کے حفظ کا مطلب صرف یہ نہیں سمجھتے تھے کہ اسے یاد کر لیا جائے' بلکہ یہ سمجھتے تھے کہ اس کا علم و فہم بھی حاصل ہو جائے اور اس پر عمل کی توفیق بھی بارگاہِ ربّ العزت سے ارزانی ہو جائے اور اس طرح قرآن ان کے فکر و عمل دونوں پر حاوی ہو جائے۔

گویا کہ ''حفظِ قرآن'' کا مطلب ان کے نزدیک یہ تھا کہ قرآن ان کی پوری شخصیت میں رچ بس جائے اور اس کا نورِ ہدایت ان کے

رگ و پے حتیٰ کہ ریشے ریشے میں سرایت کر جائے۔ نتیجتاً اس کے الفاظ ان کے حافظے میں' اس کا علم ان کے ذہن میں' اور اس کی تعلیمات ان کے اخلاق و عادات اور سیرت و کردار میں محفوظ ہو جائیں۔![1]

اسی عمل (phenomenon) کی تکمیل اور اتمامی کیفیت کا ذکر ہے معلمۂ اُمت' اُم المؤمنین حضرت عائشہ بنت ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اس غایت درجہ حکیمانہ قول میں جو انہوں نے اس سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا تھا کہ آنحضور ﷺ کی سیرت کیسی تھی؟ — کہ: ''کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنَ ''یعنی آپؐ کی سیرت تعلیماتِ قرآنی کا مکمل نمونہ تھی اور گویا کہ آپؐ مجسم قرآن تھے۔ فداہ ابی وأمی وصلی اللہ علیہ وسلم۔

غرضیکہ۔ قرآن سے استفادے کی صحیح صورت صرف یہ ہے کہ اس کا جتنا جتنا علم و فہم انسان کو حاصل ہوا سے وہ ساتھ کے ساتھ اپنے اعمال و افعال' عادات و اطوار اور سیرت و کردار کا جزو بناتا چلا جائے اور اس طرح قرآن مجید مسلسل اس کے ''خُلق'' میں سرایت کرتا چلا جائے۔ بصورتِ دیگر اس کا خدشہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے اس قول

(۱) ملاحظہ ہو ''الاتقان فی علوم القران'' کی مندرجہ ذیل روایت (بحوالہ مبادئ تدبر قرآن۔ مؤلفہ مولانا امین احسن اصلاحی)

وقد قال ابوعبد الرحمٰن السلمی حدثنا الذین کانوا یقرء ون القرآن کعثمان بن عفان و عبداللّٰہ بن مسعود وغیرھما انھم اذا کانوا تعلموا من النبی صلی اللہ علیہ وسلم عشر آیات لم یتجاوزھا حتی یعلموا مافیھا من العلم والعمل' قالوا فتعلمنا القرآن والعمل جمیعاً ولھذا کانوا یبقون مدۃ فی حفظ السورۃ

''ابوعبدالرحمٰن سلمی کہتے ہیں کہ مجھ سے ان لوگوں نے بیان کیا جو قرآن پڑھتے پڑھاتے تھے' جیسے حضرت عثمانؓ بن عفان اور عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ' کہ ان لوگوں کا دستور یہ تھا کہ اگر نبی ﷺ سے دس آیتیں بھی پڑھ لیتے تھے تو جب تک ان آیات کے تمام علم و عمل کو اپنے اندر جذب نہ کر لیتے آگے قدم نہ بڑھاتے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے قرآن کے علم و عمل دونوں کو ایک ساتھ حاصل کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک ایک سورت کے حفظ میں وہ برسوں لگا دیا کرتے تھے۔''

مبارک کے مطابق کہ: ((اَلْقُرْآنُ حُجَّةٌ لَّكَ اَوْ عَلَيْكَ)) (قرآن یا تو تمہارے حق میں حجت بنے گا یا تمہارے خلاف) قرآن کا علم و فہم الٹا انسان کے خلاف حجت قاطع اور اس کی بدعملی پر سزا و عقوبت کی شدت میں اضافے کا سبب بن جائے۔

یہاں یہ وضاحت البتہ ضروری ہے کہ ''عمل بالقرآن'' کے دو پہلو ہیں' ایک انفرادی اور دوسرا اجتماعی۔ قرآن مجید کے ایسے تمام احکام جو انسان کی انفرادی و نجی زندگی سے متعلق ہوں یا جن پر عمل کا اختیار اسے فی الفور حاصل ہو اُن کو بجالانے پر ہر انسان اسی دم مکلّف ہو جاتا ہے جس دم وہ اس کے علم میں آئیں اور ان کے معاملے میں تاخیر و تعویق کا کوئی جواز سرے سے موجود نہیں ہے۔ ایسے احکام کی اطاعت و تعمیل میں کوتاہی وہ جرم عظیم ہے جس کی سب سے بڑی سزا خذلان اور سلبِ توفیق کی شکل میں ملتی ہے' حتیٰ کہ قول و کردار اور علم و عمل کا یہ فرق و تفاوت اور ﴿لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ﴾[1] کی یہ کیفیت بالآخر نفاق پر منتج ہوتی ہے۔ یہی حقیقت ہے جو آنحضور ﷺ کے اس قولِ مبارک میں بیان ہوئی کہ:

((اَكْثَرُ مُنَافِقِیْ اُمَّتِیْ قُرَّاءُ هَا)) (مسند احمد)

''میری اُمت کے منافقین کی سب سے بڑی تعداد قراء[2] کی ہے۔''

لہٰذا سلامتی کی راہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ قرآن کا جس قدر علم بھی انسان کو حاصل ہو اس پر وہ حتی الامکان فوری طور پر عمل شروع کر دے۔

رہے دوسری قسم کے احکام' یعنی وہ جو ایسے اجتماعی معاملات سے متعلق ہوں جن پر ایک فرد کو کلی اختیار حاصل نہیں ہوتا تو ان کے بارے میں ظاہر ہے کہ ہر شخص بجائے خود مسئول و مکلّف نہیں ہوتا۔ اگرچہ وہ اس پر ضرور مکلّف ہے کہ اپنی امکانی حد تک حالات کو بدلنے اور ایسا اجتماعی ماحول برپا کرنے کی سعی و جہد کرے جس میں پورے کا پورا قرآن سمویا جا سکے اور اس کے تمام احکام کی مکمل تنفیذ کی جا سکے۔ ان حالات میں

(۱) سورۃ الصّف' آیت ۲: ''اے اہل ایمان' کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں؟''

(۲) واضح رہے کہ یہاں قراء سے مراد معروف معنی میں محض قاری نہیں' بلکہ ان میں وہ عالم بھی شامل ہیں جو قرآن پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہوں لیکن اس پر عمل نہ کریں۔

اس کی یہ کوشش اور جدوجہد ''مَعْذِرَةً اِلٰی رَبِّکُمْ ''(۱) اور ان اجتماعی احکامات کی بالفعل تعمیل کی قائم مقام ہو جائے گی۔ لیکن اگر انسان ایسی جدوجہد بھی نہ کرے اور مطمئن ہو کر بس اپنی زندگی کی بقاء اور اپنے بال بچوں کی پرورش میں لگا رہے تو اس صورت میں سخت خطرہ ہے کہ قرآن کے انفرادی و نجی نوعیت کے احکام پر عمل بھی ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ﴾(۲) کے مصداق گردانا جائے!

جس طرح فہمِ قرآن کے لئے قرآن مجید کی وسیع تر اصطلاح ''تذکر'' ہے اسی طرح قرآن پر ''عمل'' کے لئے قرآن کی سب سے جامع اور کثیر الاستعمال اصطلاح ''حُکم بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ'' ہے۔

''حکم'' کے ذیل میں قرآن مجید نے اصل الاصول تو یہ متعین کیا کہ:

---

(۱) سورۃ الاعراف' آیت ۱۶۴: ''اور جب کہا ان میں سے ایک گروہ نے کہ کیوں نصیحت کرتے ہو ایسے لوگوں کو جنہیں اللہ تعالیٰ ہلاک یا شدید عذاب میں مبتلا کر کے رہے گا' تو انہوں نے جواب دیا: تا کہ پروردگار کے یہاں ہمارا عذر قبول ہو۔ اور (پھر) کیا عجب کہ وہ (خدا سے) ڈر ہی جائیں۔''

(۲) سورۃ البقرۃ' آیت ۸۵: ''تو کیا تم ایمان رکھتے ہو کتابِ الٰہی کے کچھ حصے پر اور کفر کرتے ہو دوسرے سے؟'' ان الفاظِ مبارکہ کے بعد جو تہدید قرآن میں وارد ہوئی ہے اس کو پڑھتے ہوئے ہر صاحب دل انسان لازماً کانپ اٹھتا ہے۔ لیکن افسوس کہ ہم نے بعینہٖ یہی روش اختیار کی اور نتیجتاً اسی تہدید کا ایک عملی مظہر بن کر رہ گئے۔ یعنی یہ کہ:

''تو جو کوئی تم میں سے یہ روش اختیار کرے اس کی سزا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا میں اسے ذلیل و رسوا کیا جائے اور آخرت میں شدید ترین عذاب میں مبتلا کیا جائے'' — تو جہاں تک دنیا کی رسوائی کا تعلق ہے اس کا تو ایک عبرتناک نقشہ اُمت مسلمہ پیش کر رہی ہے۔ رہا عذابِ اُخروی' تو اس کے بھی حق دار بننے میں ہم نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ویسے اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم دستگیری فرما لے تو دوسری بات ہے:

﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْلَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۞﴾ (المائدۃ:۱۱۸)

اللہ اکبر! کیسی صادق آتی ہے ہمارے حال پر آنحضور ﷺ کی یہ حدیث مبارک کہ:

((اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتٰبِ اَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ)) (مسلم: عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ)

''اللہ تعالیٰ اس کتابِ عزیز کی وجہ سے کچھ قوموں کو عزت و سربلندی عطا فرمائے گا اور دوسروں کو ذلت و نکبت سے ہم کنار کرے گا۔''

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور ''ہم'' خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ (الانعام: ۵۷' یوسف: ۴۰ و ۶۷)

''حکم (کا اختیار) سوائے اللہ کے اور کسی کو حاصل نہیں۔''

پھر خود قرآن مجید کو ''حکم'' قرار دیا:

﴿وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۭ﴾ (الرعد: ۳۷)

''اور اسی طرح اتارا ہم نے اسے حکم بنا کر عربی زبان میں۔''

اور نبی اکرم ﷺ کا فرضِ منصبی یہ قرار دیا کہ:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ ۭ﴾ (النساء: ۱۰۵)

''بے شک اتاری ہم نے تجھ پر کتاب حق کے ساتھ تا کہ تو فیصلہ کرے لوگوں کے مابین اس سوجھ کے ساتھ جو اللہ نے تجھ کو عطا فرمائی ہے۔''

اور سورۃ المائدۃ میں دوٹوک فیصلہ سنا دیا کہ جو لوگ اللہ کی کتاب کے مطابق ''حکم'' نہ کریں وہی کافر' ظالم اور فاسق ہیں۔ (آیات ۴۴' ۴۵' ۴۶ اور ۴۷)

''حکم'' کا مفہوم ایک لفظ میں ادا کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ لفظ ''فیصلہ'' ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی اصل حقیقت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ انسان میں اصل اہمیت کی چیزیں دو ہیں' ایک اس کا فکر اور دوسرے اس کا عمل۔ ''حکم'' ایک ایسی جامع اصطلاح ہے جو بیک وقت ان دونوں کا احاطہ بھی کرتی ہے اور خاص طور پر ان کے ربط و تعلق کو واضح اور ان کے مقامِ اتصال کو نمایاں کرتی ہے۔

کوئی خیال یا نظریہ جب انسانی فکر میں ایسا رچ بس جائے کہ اس کی ''رائے'' اور ''فیصلہ'' یعنی ''حکم'' بن جائے تو اس کا عمل خود بخود اس کے تابع ہو جاتا ہے۔!

اسی حقیقت کو نمایاں کرنے کے لئے قرآن حکیم نے عمل بالقرآن کے لئے حُکم بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ کی اصطلاح استعمال کی' تا کہ یہ بات بالکل واضح ہو جائے کہ قرآن

مجید پر عمل درحقیقت اسی وقت ہوسکتا ہے جب انسان کا فکر قرآن کے تابع ہوجائے اور قرآن کا بیان کردہ علمِ حقیقت انسان کے دل اور دماغ دونوں میں جاگزیں ہوجائے۔

آسمانی کتابوں پر عمل کے لئے قرآن مجید کی دوسری اصطلاح ''اقامت'' کی ہے' جیسا کہ یہود ونصاریٰ کے بارے میں فرمایا گیا کہ:

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ؕ﴾ (المائدۃ : ٦٦)

''اور اگر وہ قائم رکھتے تورات اور انجیل کو' اور اس کو جو نازل ہوا اُن کی جانب ان کے ربّ کی طرف سے' تو کھاتے اپنے اوپر سے بھی اور اپنے پاؤں کے نیچے سے بھی۔''

اور اس کے متصلاً بعد یہ فیصلہ سنا دیا گیا:

﴿قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَیْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ﴾ (المائدۃ : ٦٨)

''کہہ دو (اے محمد ﷺ)! اے اہل کتاب! جب تک تم تورات' انجیل اور جو تمہارے ربّ کی طرف سے تمہاری جانب نازل کیا گیا ہے اسے قائم نہ کرو تم کسی بنیاد پر نہیں ہو۔''

''حُکم بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ'' کا تعلق زیادہ تر افراد کے فکر وعمل سے ہے' جبکہ ''اقامت مَا اُنْزِلَ مِنَ اللّٰہِ'' سے مراد خاص طور پر اس نظامِ عدلِ اجتماعی کا قیام ہے جو کسی اجتماعیت کے شریک افراد اور کسی معاشرے کے مختلف طبقات کے مابین قسط اور عدل وانصاف پر مبنی ''توازن'' کا ضامن ہوتا ہے اور جس میں بندھنے کے بعد کسی کے کسی پر ظلم وعدوان اور بغی وطغیان کا امکان باقی نہیں رہتا اور سیاسی جبر (Political repression) اور معاشی استحصال (Economic exploitation) سب کے دروازے بند ہوجاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ المائدۃ کی آیت ٦٦ جو ابھی میں نے آپ کو سنائی تھی' اس میں ''اقامت مَا اُنْزِلَ مِنَ اللّٰہِ'' کے ثمرات کے طور پر عمومی خوش حالی وفارغ البالی کا تذکرہ خاص طور پر کیا گیا ہے۔

اس نظامِ عدل وقسط کے قیام کا تذکرہ کمالِ اجمال وغایتِ اختصار کے ساتھ تو سورۃ الحدید کی اس آیت میں ہوا ہے کہ:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ﴾ (آیت ٢٥)

''ہم نے بھیجے اپنے رسول کھلی نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور میزان تاکہ لوگ سیدھی طرح انصاف پر قائم رہیں!''

لیکن سورۃ الشوریٰ میں اس کا بیان ایسی وضاحت کے ساتھ ہوا ہے کہ اس سے حکمِ الٰہی اور اقامتِ دین اور ایمان بالکتاب اور قیامِ نظامِ عدلِ اجتماعی کا باہمی ربط وتعلق بالکل واضح ہوجاتا ہے۔ اس سورت کے دوسرے رکوع میں ایک نہایت حکیمانہ تدریج وترتیب کے ساتھ اس مضمون کی تفاصیل بیان ہوئی ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے وہی اصل الاصول بیان ہوا جس کا تذکرہ میں پہلے کرچکا ہوں' یعنی یہ کہ حکم کا اصل اختیار اللہ تعالیٰ کو ہے۔ چنانچہ آیت نمبر ١٠ میں ارشاد ہوا:

﴿وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَیْءٍ فَحُكْمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ﴾

''اور جس معاملے میں بھی تمہارے مابین اختلاف ہو اُس کے فیصلے کا حق اللہ ہی کو ہے۔''

پھر آیت نمبر ١٣ میں اس حکمِ الٰہی کے دین وشریعت کی شکل میں ڈھلنے کی تفصیل بیان ہوئی ہے کہ:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِیْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰۤى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ﴾

''راستہ مقرر کردیا تمہارے لئے دین میں وہی جس کا حکم دیا تھا نوح کو اور جو وحی کیا ہم نے (اے نبیؐ) تیری طرف اور جس کا حکم دیا ہم نے ابراہیم' موسیٰ اور عیسیٰ کو' کہ قائم رکھو دین اور مت اختلاف میں پڑو اِس کے بارے میں!''

پھر آیت نمبر ١٥ میں آنحضور ﷺ سے خطاب کرکے فرمایا گیا:

﴿فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ

بِمَا اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنۡ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَيۡنَكُمۡ ؕ﴾

’’پس تو اسی کی دعوت دے اور قائم رہ جیسا حکم ہوا تجھے اور مت پیچھے چل ان کی خواہشوں کے اور کہہ دے کہ میں ایمان لایا اس کتاب پر جو نازل فرمائی ہے اللہ نے اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے مابین عدل کرو۔‘‘

پھر آیت نمبر ۱۷ میں اس پوری بحث کا خاتمہ ان جامع الفاظ پر ہوا کہ:

﴿اَللّٰهُ الَّذِىۡۤ اَنۡزَلَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ وَالۡمِيۡزَانَ ؕ وَمَا يُدۡرِيۡكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيۡبٌ ۝﴾

’’اللہ ہی تو ہے جس نے اتاری کتابِ کامل حق کے ساتھ اور میزان بھی۔ اور تجھے کیا خبر‘ شاید قیامت قریب ہی ہے۔‘‘

سورۃ الحدید کی متذکرہ بالا آیت کی طرح سورۃ الشوریٰ کی اس آیت میں بھی کتاب کے ساتھ ’’میزان‘‘ کا لفظ بھی وارد ہوا ہے۔ اس کی تشریح میں مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے بڑی جامع بات فرمائی ہے کہ:

’’اللہ نے مادی ترازو بھی اتاری جس میں اجسام تلتے ہیں‘ اور علمی ترازو بھی جسے عقل سلیم کہتے ہیں اور اخلاقی ترازو بھی جسے صفت عدل وانصاف کہا جاتا ہے‘ اور سب سے بڑی ترازو دین حق ہے جو خالق اور مخلوق کے حقوق کا ٹھیک ٹھیک تصفیہ کرتا ہے اور جس میں بات پوری تلتی ہے‘ نہ کم نہ زیادہ!‘‘

قرآن مجید تشتّت وانتشار اور افتراق واختلاف کا اصل سبب ’’بَغۡيًا بَيۡنَهُمۡ‘‘ کو قرار دیتا ہے‘ چنانچہ سورۃ الشوریٰ کے اس دوسرے رکوع میں بھی ’’وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِيۡهِ‘‘ کے تاکیدی حکم کے بعد آیت نمبر ۱۴ میں تفرقہ وانتشار کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ:

﴿وَمَا تَفَرَّقُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَهُمُ الۡعِلۡمُ بَغۡيًا بَيۡنَهُمۡ ؕ﴾

’’اور نہیں تفرقے میں پڑے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس ’العلم‘ پہنچ چکا‘ ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کی غرض سے۔‘‘

دین حق اور اللہ کی نازل کردہ کتاب اور میزان کی اقامت سے اس بغی وطغیان

کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں‘ پھر نہ احبار اور رہبان کے لئے موقع رہتا ہے کہ وہ ’’اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ‘‘ بن کر بیٹھ سکیں‘ نہ سرمایہ ’’دُوۡلَةً بَيۡنَ الۡاَغۡنِيَآءِ مِنۡكُمۡ‘‘[1] کی صورت اختیار کر سکتا ہے‘ نہ ہی کسی سیاسی جبر واستبداد کا موقع باقی رہتا ہے‘ بلکہ تمام انسان اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بھائی بن جاتے ہیں اور ان کے اولوا الامر کا فرض یہ قرار پاتا ہے کہ وہ ہر ضعیف کو قوی سمجھیں جب تک اسے اس کا حق نہ دلوا دیں اور ہر قوی کو ضعیف سمجھیں جب تک اس سے حق وصول نہ کر لیں۔ ’’اقامة مَا اُنۡزِلَ مِنَ اللّٰهِ‘‘ کے ذریعے ایسے عادلانہ ومنصفانہ نظامِ اجتماعی کا قیام کتابِ الٰہی کے ماننے والوں کا وہ فرض ہے جس پر وہ بحیثیت مجموعی مکلّف ہیں اور جس کے بارے میں جوابدہی کی فکر انہیں کرنی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ الشوریٰ میں اس سلسلۂ مضمون کے آخر میں یہ فرما کر کہ کیا عجب کہ قیامت قریب ہی ہو‘ متنبہ کر دیا گیا ہے کہ کتاب اور میزان کے حقوق کی ادائیگی کی جلد فکر کرو‘ ایسا نہ ہو کہ تم لیت ولعل اور تاخیر وتعویق ہی میں پڑے رہو اور آخری حساب کتاب کی گھڑی اچانک آن کھڑی ہو۔ اور اللہ کی کتاب اور میزان کا حق صرف اس طرح ادا ہو سکتا ہے کہ بفحوائے ﴿لِيَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ﴾ اور ﴿وَاُمِرۡتُ لِاَعۡدِلَ بَيۡنَكُمۡ﴾ اس نظامِ عدلِ اجتماعی کو عملاً قائم کر دیا جائے جو اللہ نے دین وشریعت کی صورت میں عطا فرمایا ہے۔

پوچھا جا سکتا ہے کہ کتابِ الٰہی کے اس حق کی ادائیگی کے لئے کیا عملی تدبیر اختیار کی جائے؟ تو اگرچہ یہ موضوع میری اس وقت کی گفتگو سے براہِ راست متعلق نہیں تاہم یہ اشارہ مناسب بلکہ ضروری ہے کہ اقامتِ دین اور قیام نظامِ عدلِ قرآنی کی جدوجہد کو دنیا کی کسی دوسری سیاسی‘ معاشی یا معاشرتی تحریک پر قیاس کرنا نہایت غلط اور اس کا عملی نقشہ کسی دوسری تحریک سے اخذ کرنا سخت مضر ہی نہیں انتہائی مہلک ہے۔ جس طرح ایک فرد میں اسلام کی مطلوبہ تبدیلی کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ کہ پہلے قرآن کو اس کے دل ودماغ میں اتارا جائے تاکہ اس کا ذہن وفکر اور جذبات واحساسات سب

(۱) سورۃ الحشر‘ آیت ۷: ’’تمہارے دولت مندوں ہی کے مابین الٹ پھیر میں‘‘۔

قرآن کے تابع ہو جائیں‘ نتیجتاً اس کا عمل ازخود قرآن کے تابع ہو جائے گا‘ اسی طرح کسی ہیئتِ اجتماعی میں بھی اسلامی انقلاب صرف اس طرح برپا کیا جا سکتا ہے کہ پہلے اس کے ذہین اور سوچنے اور سمجھنے والے طبقات کے قلوب واذہان نورِقرآن سے منور ہوں اور ان کے ’’فکر ونظر‘‘ میں قرآنی انقلاب برپا ہو جائے۔ کسی ہیئتِ اجتماعیہ کے اصحابِ علم وفکر کے طبقے میں ایمان اور یقین کا ایک مضبوط مرکز (nucleus) قائم ہو جائے تو پھر اس سے نورِ ایمان اور بصیرتِ دینی ان دوسرے طبقات میں لازماً سرایت کریں گے جو جسدِ اجتماعی میں اعضاء وجوارح کی حیثیت رکھتے ہیں اور رفتہ رفتہ پوری اجتماعیت نورِ ایمان سے جگمگا اٹھے گی اور پورے کا پورا دین اپنے مکمل نظامِ عدلِ اجتماعی سمیت عملاً قائم ہو سکے گا_ اس ایک راہ کے سوا اقامتِ دین کی کوئی اور راہ موجود نہیں اور یہ خیال تو بالکل ہی خام اور ’’اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ‘‘(۱) کا کامل مصداق ہے کہ کسی مسلمان قوم کے اسلام کے ساتھ ایک موروثی مذہب کی حیثیت سے جذباتی لگاؤ اور تعلق کو مشتعل (exploit) کر کے ایک سیاسی تحریک برپا کر دینے سے قرآن کا نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ اصل بات جو اس وقت عرض کرنی مقصود ہے‘ یہ ہے کہ قرآن مجید پر عمل یعنی ’’حُکم بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ‘‘ اور ’’اقامت مَا اُنزِلَ مِنَ اللّٰہ ‘‘ قرآن مجید کا وہ حق ہے جو ہر مسلمان پر اس کی انفرادی حیثیت میں اور پوری اُمتِ مسلمہ پر اجتماعی اعتبار سے عائد ہوتا ہے اور جس کی ادائیگی کی فکر ہم میں سے ہر شخص کو انفرادی طور پر اور پوری اُمت کو اجتماعی طور پر کرنی چاہیے۔

(۱) سورۃ العنکبوت‘ آیت ۴۱: ’’اور سب گھروں میں سب سے بودا گھر مکڑی کا گھر ہے‘‘۔

پانچواں حق

تبلیغ وتبیین

ماننے‘ پڑھنے‘ سمجھنے اور عمل کرنے کے علاوہ قرآن مجید کا ایک اور حق بھی ہر مسلمان پر حسبِ صلاحیت واستعداد عائد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ وہ اسے دوسروں تک پہنچائے۔

پہنچانے کے لئے قرآن حکیم کی اصل اور جامع اصطلاح ’’تبلیغ‘‘ ہے‘ لیکن تبلیغ کے پہلو بھی بہت سے ہیں اور مدارج ومراتب بھی۔ حتیٰ کہ تعلیم بھی تبلیغ ہی کا ایک شعبہ اور تبیین بھی اسی کا ایک بلند تر درجہ ہے۔

قرآن حکیم خود اپنے مقصدِ نزول کی تعبیر اِن الفاظ میں کرتا ہے:

﴿هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ وَلِيُنْذَرُوْا بِهٖ﴾ (ابراھیم : ۵۲)

’’یہ (قرآن) پہنچا دینا ہے لوگوں کے لئے اور تاکہ وہ اس کے ذریعے خبردار کر دیئے جائیں۔‘‘

اور نبی اکرم ﷺ پر اپنے نزول کا اوّلین مقصد یہ قرار دیتا ہے کہ:

﴿وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ؕ﴾ (الانعام : ۱۹)

’’اور وحی کیا گیا میری طرف یہ قرآن تاکہ میں تمہیں اور جنہیں بھی یہ پہنچ جائے انہیں اس کے ذریعے خبردار کر دوں۔‘‘(۱)

ساتھ ہی اس بات کو غیر مبہم الفاظ میں واضح کر دیتا ہے کہ اس قرآن پاک کی بلاکم وکاست اور بعینہٖ تبلیغ آنحضور ﷺ کا وہ فرضِ منصبی ہے جس میں ادنیٰ کوتاہی بھی فرائضِ نبوت ورسالت میں تقصیر شمار ہوگی۔ چنانچہ سورۃ المائدۃ میں انتہائی تاکیدی حکم دیا گیا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ﴾ (المائدۃ : ۶۷)

(۱) واضح رہے کہ ایک بگڑے ہوئے معاشرہ میں ’’تبلیغ‘‘ کا پہلا قدم ’’انذار‘‘ ہی کا ہوتا ہے۔

''اے رسولؐ! جو کچھ تم پر تمہارے ربّ کی طرف سے نازل ہوا ہے اس کی (بلا کم وکاست) تبلیغ کرو!اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے خدا کے فرضِ رسالت کو ادا نہیں کیا۔''

بعثت کی پہلی ساعت سے لے کر حیاتِ دُنیوی کی آخری گھڑی تک مسلسل تیئیس سال آنحضورﷺ اپنے اس فرضِ منصبی کی ادائیگی کے لئے محنت ومشقت اٹھاتے اور شدائد ومصائب برداشت کرتے رہے اور اس عرصہ میں آپؐ کی دعوت اگرچہ بہت سے مراحل سے گزری جن میں آپؐ کی مصروفیات بہت متنوع نظر آتی ہیں' لیکن اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس پورے عرصے میں آپؐ کی جدوجہد کا اصل محور قرآن مجید ہی رہا' اور اسی کی تلاوت وتبلیغ اور تعلیم وتبیین میں آپؐ مسلسل مصروف رہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں چار مقامات پر آپؐ کے طریقِ دعوت وتبلیغ اور نہجِ اصلاح وانقلاب کی وضاحت ان الفاظ میں ہوئی ہے کہ:

﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ج﴾

(آل عمران : ١٦٤' الجمعة : ٢)

''وہ (آنحضورﷺ) تلاوت کرتے ہیں ان پر اس (خدا) کی آیات' اور تزکیہ کرتے ہیں ان کا' اور تعلیم دیتے ہیں ان کو کتاب اور حکمت کی۔''

ظاہر ہے کہ ان الفاظِ کریمہ کا مطلب وہی ہے جو میں اس سے قبل آپ کے سامنے اسلامی انقلاب کے مخصوص طریق کی وضاحت کے ضمن میں بیان کر چکا ہوں۔ بہرحال اس طریق پر مسلسل تیئیس برس محنت کر کے آنحضورﷺ نے قرآن مجید کی تبلیغ کا حق ادا فرما دیا' اور اللہ کی امانت اس کے بندوں تک پہنچا دی۔ ادائے امانتِ الٰہی کی اس جدوجہد کے دوران بھی آپ نے اپنے جاں نثاروں(۱) سے اپنے اس فرضِ منصبی کی ادائیگی میں اس تاکیدی حکم کے ذریعے تعاون حاصل فرمایا کہ:

((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰيَةً))

(۱) ان نفوسِ قدسیہ میں سے حضرت مصعب بن عمیرؓ کی مثال تو حد درجہ تابناک ہے' جن کی تعلیم وتربیت کے ذریعے ہی مدینہ منورہ میں انقلاب برپا ہوا اور یہ سرزمین ''دار الہجرت'' کا شرف واعزاز پانے کے قابل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے!

''پہنچاؤ میری جانب سے چاہے ایک ہی آیت!''

اور اپنے مشن کی تکمیل پر۔ مستقبل کے لئے فریضۂ تبلیغِ قرآن کی پوری ذمہ داری اپنی اُمت کے حوالے فرما دی۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے خطبے میں سوا لاکھ سے زائد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے متعدد بار یہ شہادت لے کر کہ میں نے تبلیغ کا حق ادا کر دیا ہے' آئندہ کے لئے یہ مستقل ہدایت جاری فرما دی کہ: ((فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) یعنی اب جو لوگ یہاں موجود ہیں ان کا فرض ہے کہ ان تک پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں۔ اور اس طرح قیامت تک کے لئے فریضۂ تبلیغ قرآن کا بوجھ امتِ محمدﷺ کے کاندھوں پر آ گیا جس کے لئے بحیثیت مجموعی وہ خدا کے ہاں مسئول ہو گی۔ اب ظاہر ہے کہ اُمت افراد ہی پر مشتمل ہے۔ لہٰذا اس اُمت کا ہر فرد اپنی صلاحیت واستعداد کے مطابق اس فرض کی ادائیگی کا ذمہ دار ہے۔ علماء اور فضلاء پر ذمہ داری ان کے علم و استعداد کی نسبت سے عائد ہوتی ہے اور عوام پر ان کی صلاحیت کی نسبت سے۔

بہر نوع آنحضورﷺ کے ان مبارک الفاظ کے عموم سے کہ ''بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آيَةً'' ثابت ہوتا ہے کہ اس ذمہ داری سے بالکل بَری کوئی بھی نہیں۔ جسے ناظرہ پڑھنا آتا ہے وہ دوسروں کو ناظرہ پڑھنا سکھا دے' جسے حفظ ہے وہ دوسروں کو یاد کرائے' جسے ترجمہ آتا ہے وہ دوسروں کو ترجمہ پڑھائے اور جسے اس کا کچھ علم وفہم حاصل ہے وہ اسے دوسروں تک پہنچائے۔ حتیٰ کہ اگر کسی کو ایک آیت ہی یاد ہو اور وہ اسے ہی دوسروں کو یاد کرا دے یا قرآن کی کسی ایک آیت یا سورت کا مفہوم معلوم ہو اور وہ صرف اسی کا علم دوسروں تک منتقل کر دے تو یہ بھی ''تبلیغِ قرآن'' میں شامل ہے۔ اگرچہ اس مقدس اور عظیم الشان فرض کی ادائیگی کی جو ذمہ داری اُمتِ مسلمہ پر بحیثیتِ

مجموعی عائد ہوتی ہے وہ صرف اس وقت پوری ہوسکتی ہے جب قرآن
کا متن اوراس کا مفہوم اطراف واکنافِ عالم تک پہنچا دیا جائے!

بحالاتِ موجودہ یہ ایک بہت دُور کی بات اورسہانا خواب معلوم ہوتا ہے' اس لئے کہ واقعی صورت حال یہ ہے کہ وہ اُمت کو قرآن کو اقوام واُممِ عالم تک پہنچانے کی ذمہ دار بنائی گئی تھی آج اس کی محتاج ہے کہ خود اسے قرآن ''پہنچایا'' جائے۔لہٰذا اس وقت اصل ضرورت اس کی ہے کہ خود اُمت مسلمہ میں تعلیم وتعلّمِ قرآن کی ایک رَو چل نکلے اور مسلمان درجہ بدرجہ قرآن سیکھنے اورسکھانے میں لگ جائے۔میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔آمین!

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا' تبلیغ ہی کا ایک شعبہ تعلیم بھی ہے اور اسی کا ایک اعلیٰ درجہ وہ ہے جسے قرآن حکیم ''تبیین'' کا نام دیتا ہے۔یعنی یہ کہ قرآن مجید کو صرف ''پہنچا'' ہی نہ دیا جائے بلکہ اس کی پوری وضاحت کی جائے۔اورایک تو جیسا کہ میں نے قرآن پر تدبر کے ضمن میں عرض کیا تھا' لوگوں کے ذہنوں کے قریب ہو کر کلام کیا جائے اور قرآن کا نورِ ہدایت لوگوں کی نگاہوں کے عین سامنے روشن کر دیا جائے اور دوسرے یہ کہ اس کی سُور وآیات کے مدلولات ومتضمنات کو پوری طرح کھول دیا جائے۔قرآن حکیم نے اپنے آپ کو 'بیان' کے لفظ سے بھی تعبیر کیا ہے' جیسے:

﴿هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ (آلِ عمران : ۱۳۸)

''یہ وضاحت ہے لوگوں کے واسطے اور ہدایت اور نصیحت ہے ڈرنے والوں کے لئے۔''

اور اپنے لئے ''مبین'' اور اپنی آیات کے لئے ''بیّنات'' اور ''مبیّنات'' کی صفات کا استعمال نہایت کثرت سے کیا ہے۔ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ کتبِ الٰہی کی تبیین وتوضیح انبیاءِ کرام علیہم السلام کی ذمہ داری بھی ہے اور ان اُمتوں کی بھی جو اِن کی حامل بنائی جاتی ہیں' جیسا کہ آنحضور ﷺ سے خطاب کر کے فرمایا گیا کہ:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل : ٤٤)

''اور اتاری ہم نے تجھ پر یہ ''یاددہانی'' تاکہ تو واضح کر دے لوگوں کے سامنے

جو کچھ اترا ہے ان کے لئے۔''

اور اہلِ کتاب کے بارے میں فرمایا گیا کہ ان سے تبیین کتاب کا عہد لیا گیا تھا:

﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ﴾ (آلِ عمران : ۱۸۷)

''اور جب عہد لیا اللہ نے ان سے جنہیں عطا فرمائی گئی کتاب' کہ اس کو واضح کرو گے لوگوں کے لئے۔''

لیکن جب انہوں نے اپنے اس فرض کو ادا نہ کیا اور اُلٹا کتمانِ حق کے مرتکب ہوئے تو لعنت خداوندی کے مستحق قرار دیئے گئے۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۝﴾ (البقرۃ : ۱۵۹)

''بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں اس واضح تعلیم اور ہدایت کو جو ہم نے نازل فرمائی ہے اس کے بعد کہ واضح کر دیا ہم نے اس کو لوگوں کے لئے اپنی کتاب میں' تو لعنت کرتا ہے ان پر اللہ اور لعنت کرتے ہیں سب لعنت کرنے والے۔''

اس ''تبیین'' کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ ہر قوم پر اس کی عام زبان اور آسان محاورے میں سہل انداز سے قرآن مجید کا سرسری مفہوم واضح کر دیا جائے۔اس لئے کہ کسی قوم کے لئے تبیینِ قرآن اس کی اپنی زبان ہی میں ہوسکتی ہے' جیسا کہ فرمایا گیا کہ:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ۭ﴾ (ابراھیم : ٤)

''اور ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر بولی بولنے والا اپنی قوم ہی کی تاکہ واضح کر دے ان پر (اللہ کا پیغام)۔''

اور اس کا آخری درجہ یہ ہے کہ کتابِ الٰہی کے علم وحکمت اور اس کے مضمرات ومقدرات کو کھول کر بیان کیا جائے' اس کے نہجِ استدلال کو واضح کیا جائے' اس کے دلائل وبراہین کی مدد سے تمام گمراہ کن خیالات ونظریات کی مدلل تردید کی جائے' اور وقت کی بلند ترین علمی سطح پر اعلیٰ ترین علمی استدلال کے ساتھ قرآن حکیم اور اس کی تعلیمات کی حقانیت کو مبرہن کر دیا جائے۔تبیینِ قرآن کے ادنیٰ درجے کے حق کی ادائیگی کی صورت فی الوقت یہ ہے کہ دنیا کی ہر قابلِ ذکر زبان میں قرآن مجید کے فصیح و

بلیغ تراجم مع مختصر تشریح و تفسیر شائع کئے جائیں اور ان کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی جائے۔ اور اعلیٰ درجہ میں اس کے حق کی ادائیگی صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ' جیسا کہ میں نے تدبرِ قرآن کے ضمن میں عرض کیا تھا' عالمِ اسلام میں جابجا اکیڈمیاں اور یونیورسٹیاں قائم ہوں جن کا مرکزی موضوع قرآن حکیم ہو اور ان کے ذریعے اعلیٰ ترین علمی سطح پر قرآن مجید کی ہدایت کی وضاحت کی جائے۔

حضرات! یہ ہیں قرآن مجید کے وہ حقوق جو میرے فہم کے مطابق ہم سب پر بحیثیت مسلمان عائد ہوتے ہیں اور جن کی ادائیگی کی فکر ہمیں کرنی چاہئے۔ ہم وہ خوش قسمت قوم ہیں جس کے پاس اللہ کا کلامِ پاک مِن وعن محفوظ اور موجود ہے۔ یہ بات جہاں بڑے اعزاز کا باعث ہے وہیں اس کی بنا پر ایک بہت بڑی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ ہم سے پہلے کتابِ الٰہی کے حامل بنی اسرائیل بنائے گئے تھے' لیکن جب انہوں نے اس منصبِ عظمیٰ کی ذمہ داریوں کو ادا نہ کیا اور ثابت کر دیا کہ وہ اس اعزاز و اکرام کے لائق نہیں تو ایک دوسری اُمت برپا کر دی گئی اور اسے قرآن مجید کا حامل بنا کر کھڑا کر دیا گیا۔ سورۃ الجمعۃ کی آیت ۵ میں کتابِ الٰہی کے حامل ہو کر اس کے حقوق کو ادا نہ کرنے والوں کے لئے پہلے ایک مثال بیان کی گئی ہے کہ:

﴿مَثَلُ الَّذِیۡنَ حُمِّلُوا التَّوۡرٰىۃَ ثُمَّ لَمۡ یَحۡمِلُوۡہَا کَمَثَلِ الۡحِمَارِ یَحۡمِلُ اَسۡفَارًا ؕ﴾

''ان لوگوں کی مثال جو حاملِ تورات بنائے گئے' پھر نہ اٹھایا انہوں نے اس (کی ذمہ داری) کو' اس گدھے کی سی ہے جو کتابوں کا بوجھ پیٹھ پر لادے پھر رہا ہو۔''

اور پھر اس کے فوراً بعد واضح کر دیا گیا کہ ان کا طرزِ عمل آیاتِ الٰہی کی تکذیب کے مترادف ہے۔

﴿بِئۡسَ مَثَلُ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ ؕ﴾

''بُری ہے مثال ان لوگوں کی جو جھٹلاتے ہیں اللہ کی آیات کو۔''

اور ساتھ ہی یہ سنت اللہ بھی بیان کر دی گئی ہے کہ:

﴿وَاللّٰہُ لَا یَہۡدِی الۡقَوۡمَ الظّٰلِمِیۡنَ ۞﴾

''اور اللہ (ایسے) ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

مَیں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ میرا یا آپ کا شمار اللہ کے نزدیک ان لوگوں میں ہو اور دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں صحیح معنی میں قرآن کا حامل بنائے۔

سورۃ الفرقان کی اس آیتِ کریمہ میں کہ:

﴿وَقَالَ الرَّسُوۡلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوۡمِی اتَّخَذُوۡا ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَہۡجُوۡرًا ۞﴾ (آیت ۳۰)

''اور کہا رسولؐ نے اے میرے ربّ! میری قوم نے اس قرآن کو نظر انداز کر دیا۔''

اگرچہ اصلاً تذکرہ ان کفار کا ہے جن کے نزدیک قرآن سرے سے کوئی قابلِ التفات چیز ہے ہی نہیں' لیکن قرآن کے وہ ماننے والے یقیناً اس کے ذیل میں آتے ہیں جو عملاً قرآن کے ساتھ عدم توجہ و التفات کی روش اختیار کریں۔ چنانچہ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''آیت میں اگرچہ مذکور صرف کافروں کا ہے تاہم قرآن کی تصدیق نہ کرنا' اس میں تدبر نہ کرنا' اس پر عمل نہ کرنا' اس کی تلاوت نہ کرنا' اس کی تصحیحِ قراءت کی طرف توجہ نہ کرنا' اس سے اعراض کر کے دوسری لغویات یا حقیر چیزوں کی طرف متوجہ ہونا' یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ ہجرانِ قرآن کے تحت میں داخل ہو سکتی ہیں''۔ (۱)

میں ایک بار پھر اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ ہمارا شمار ایسے لوگوں میں

(۱) عجیب اتفاق ہے' بلکہ یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے ذاتِ نبوی (ﷺ) سے قرب کی دلیل ہیں وہ الفاظ جو مولانا کے ان الفاظ کے بالکل مشابہ ایک حدیث میں وارد ہوئے جو حضرت عبیدہ ملیکی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور جس کے مطابق آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((یَا اَہۡلَ الۡقُرۡآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الۡقُرۡآنَ وَاتۡلُوۡہُ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ مِنۡ آنَاءِ اللَّیۡلِ وَالنَّہَارِ وَاَفۡشُوۡہُ وَتَغَنَّوۡہُ وَتَدَبَّرُوۡا فِیۡہِ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ)) (شعب الایمان للبیہقی' بحوالہ معارف الحدیث' جلد پنجم)

''اے قرآن والو! قرآن کو بس اپنا تکیہ ہی نہ بنالو' بلکہ دن اور رات کے اوقات میں اس کی تلاوت کیا کرو جیسا اس کی تلاوت کا حق ہے' اور اس کو (چار دانگ عالم میں) پھیلاؤ' اور اس کو خوش الحانی سے حظ لیتے ہوئے پڑھا کرو' اور اس پر غور و فکر کرو' تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ہو۔اور اس دعاءِ ماثورہ پر اپنی اس تقریر کو ختم کرتا ہوں جو بالعموم صرف ختمِ قرآن پر پڑھی جاتی ہے‘ لیکن جس کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ ہمیں کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے رہنا چاہئے تاکہ ہمیں قرآن مجید کے حقوق ادا کرنے کی توفیق بارگاہِ ربّ العزت سے حاصل ہو جائے:

اَللّٰھُمَّ ارْحَمْنَا بِالْقُرْآنِ الْعَظِیْمِ وَاجْعَلْهُ لَنَا اِمَامًا وَّنُوْرًا وَھُدًی وَّرَحْمَةً‘ اَللّٰھُمَّ ذَكِّرْنَا مِنْهُ مَا نَسِیْنَا وَعَلِّمْنَا مِنْهُ مَا جَهِلْنَا وَارْزُقْنَا تِلَاوَتَهٗ آنَاءَ اللَّیْلِ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ وَاجْعَلْهُ لَنَا حُجَّةً یَّا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ (آمین)

’’پروردگار! ہم پر قرآن عظیم کی بدولت رحم فرما اور اسے ہمارے لئے پیشوا‘ نور اور ہدایت و رحمت بنا دے۔ پروردگار! اس میں سے جو کچھ ہم بھولے ہوئے ہیں وہ ہمیں یاد کرا دے اور جو ہم نہیں جانتے ہمیں سکھا دے۔اور ہمیں توفیق عطا فرما کہ اس کی تلاوت کریں راتوں کو بھی اور دن کے حصوں میں بھی اور بنا دے اسے دلیل ہمارے حق میں اے تمام جہانوں کے پروردگار! (آمین)

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ سے) سبحان اللہ کتنا پیارا ہے وہ خطاب جو اس اُمت کو ملا — اور کتنے جامع ہیں حدیث شریف کے الفاظ جنہوں نے مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق کا کمال اختصار کے ساتھ احاطہ کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری سینکڑوں تقریریں قربان آنحضور ﷺ کے ان چند الفاظ مبارکہ پر — بالکل سچ فرمایا آنحضور ﷺ نے کہ ((اُوْتِیْتُ جَوَامِعُ الْكَلِمِ)) (مجھے نہایت جامع کلمات عطا ہوئے ہیں) فِدَاهُ اَبِیْ وَاُمِّیْ وَصَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔

ایک عظیم ماثور دعا

عبدیت کاملہ کا مظہر اَتم

اور

’’شِفَاءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ‘‘ کی کامل تفسیر

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ اَمَتِكَ ‘ فِیْ قَبْضَتِكَ‘ نَاصِیَتِیْ بِیَدِكَ ‘ مَاضٍ فِیَّ حُكْمُكَ‘ عَدْلٌ فِیَّ قَضَاءُكَ‘ اَسْئَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ‘ سَمَّیْتَ بِهٖ نَفْسَكَ‘ اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ‘ اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ كِتَابِكَ‘ اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِهٖ فِیْ مَكْنُوْنِ الْغَیْبِ عِنْدَكَ‘ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ وَنُوْرَ صَدْرِیْ وَجِلَاءَ حُزْنِیْ وَذَهَابَ هَمِّیْ وَ غَمِّیْ۔ آمِیْنَ یَا رَبَّ الْعَالَمِیْنَ!

’’اے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں‘ تیرے ایک ناچیز غلام اور ادنیٰ کنیز کا بیٹا ہوں‘ مجھ پر تیرا ہی کامل اختیار ہے اور میری پیشانی تیرے ہی ہاتھ ہے‘ نافذ ہے میرے بارے میں تیرا ہر حکم اور عدل ہے میرے معاملے میں تیرا ہر فیصلہ۔ میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں تیرے ہر اُس اسم پاک کے واسطے سے جس سے تو نے اپنی ذاتِ مقدس کو موسوم فرمایا‘ یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو تلقین فرمایا‘ یا اپنی کسی کتاب میں نازل فرمایا‘ یا اسے اپنے مخصوص خزانۂ غیب ہی میں محفوظ رکھا‘ کہ تو بنا دے قرآن مجید کو میرے دل کی بہار اور میرے سینے کا نور اور میرے رنج و حزن کی جلا اور میرے تفکرات اور غموں کے ازالے کا سبب۔ ایسا ہی ہو اے تمام جہانوں کے پروردگار!

(مسند احمد و رزین۔ بروایت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ)

مسلمانوں کی زبوں حالی کا اصل سبب
اوراس کے تدارک کے لئے کرنے کا اصل کام

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ (اسیر مالٹا) کے تاثرات

''میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دُنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا' دوسرے آپس کے اختلافات اورخانہ جنگی۔ اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے' بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی میں قائم کئے جائیں' بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے' اورمسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔''

(ماخوذ از وحدتِ اُمت' تالیف مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ)

زوالِ امت کا اصل سبب اوراس کا علاج

مولانا ابوالکلام آزاد کی نظر میں

''اگر ایک شخص مسلمانوں کی تمام موجودہ تباہ حالیوں اور بدبختیوں کی علتِ حقیقی دریافت کرنا چاہے اورساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دے کہ صرف ایک ہی علتِ اصلی ایسی بیان کی جائے جو تمام علل واسباب پر حاوی اور جامع ہو تو اس کو بتایا جا سکتا ہے کہ علماءِ حق و مرشدینِ صادقین کا فقدان اور علماءِ سوء و مفسدین دجالین کی کثرت...... رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَ نَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا...... اور پھر اگر وہ پوچھے کہ ایک ہی جملہ میں اس کا علاج کیا ہے' تو اس کو امام مالکؒ کے الفاظ میں جواب ملنا چاہئے کہ ''لَا يَصْلُحُ آخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا '' یعنی اُمت مرحومہ کے آخری عہد کی اصلاح کبھی نہ ہو سکے گی' تاوقتیکہ وہی طریق اختیار نہ کیا جائے جس سے اس کے ابتدائی عہد نے اصلاح پائی تھی' اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ قرآن حکیم کے اصلی و حقیقی معارف کی تبلیغ کرنے والے مرشدینِ صادقین پیدا کئے جائیں''۔

(ماخوذ از ''البلاغ'' جلد اوّل' شمارہ اوّل' مورخہ ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء)

مرکزی **انجمن خُدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ......اور...... سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم وحِکمت** کی

وسیع پیمانے ......اور......اعلیٰ علمی سطح

پرتشہیر واشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہوجائے

اوراس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ -اور- غلبہ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہوسکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ

تنظیمِ اسلامی کا پیغام — نظامِ خلافت کا قیام

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید**